احساس کے دریچے
فیروزہ یاسمین

احساس کے دریچے

مصنفہ :

فیروزہ یاسمین

اندراجاتِ ضروری

کتاب کا نام: احساس کے دریچے

نام مصنفہ : فیروزہ یاسمین

تعلیم : ایم۔اے

والد کا نام : جناب نور محمد خان صاحب عرف پٹھان میاں مرحوم ہاکی کے مشہور کھلاڑی۔

تایا ابا کا نام : شریف محمد خان فکری۔شریف فکریؔ صاحب

ناشر : اشرف ندیمؔ

تعداد : پانچ سو

سن اشاعت : ۲۰۰۹ء

دیگر تصانیف : اختر سعید خاں شخصیت اور فن (مقالہ ۲۰۰۵ء) مجموعہ نظم زیر طباعت۔

زرِ تعاون : ۱۰۰ روپے

کمپوزنگ : محمد افروز قاسمی، ایکٹیو کمپیوٹر سینٹر، بدھوارہ بھوپال-موبائل: 9893059352

طباعت : آلوک پریس، تلیا بھوپال

دستیاب ہو سکتی ہے:-

۱- بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ، بھوپال

۲- فیروزہ یاسمین A-174 ہاؤسنگ بورڈ کالونی، کوہِ فضا بھوپال

۳- مکتبۂ شرقیہ، ابراہیم پورہ، بھوپال

فہرست

آراء

انتساب

میری پہلی کتاب کی طرح یہ کتاب بھی میں اپنے شوہر جناب عین الحق خاں صاحب اور ہمشیرہ محترمہ برجیس انجم صاحبہ کے نام معنون کرتے ہوئے خود کو احساس طمانیت سے سرشار پاتی ہوں۔

جناب عین الحق صاحب جو انجینئر اور حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں اور میری ادبی کاوشوں کو سراہتے ہیں۔

محترمہ برجیس انجم صاحبہ خواتین کی ادبی انجمن ''بزم سب رنگ'' کی نائب صدر ہیں اور بہترین مقالہ نگار بھی ہیں۔ خواتین میں ادبی فضا کو معطر کئے ہوئے ہیں۔

فیروزہ یاسمین

کچھ اپنی باتیں

میں نے اس کتاب ''احساس کے دریچے'' میں حقیقتوں کے رنگ صداقتوں کی آنچ رحم کے سائے اور خوشگوار ہوا کے جھونکوں کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے دل سے نکلے ہوئے احساس ہر ایک پڑھنے والے کے دل میں داخل ہو جائیں اور ہم سماج کی تمام اچھائیوں و برائیوں کی جانب اپنی نگاہ ڈالتے رہیں اسی میں ہماری سماج کی بھلائی ہوگی اور ادب کا صحیح مقصد بھی۔

میرے والد کی ابتدا سے یہی تربیت رہی کہ دوسروں کی مدد کو اپنا فرض اوّلین سمجھو ان کی اس پاک باز زندگی کا اختتام بھی اسی انداز میں ہوا کہ نماز مغرب کے سجدے میں سانسوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

میری پیاری والدہ کہا کرتی تھیں کہ تمہارے والد کی زندگی ایک بہترین کتاب کی مانند تھی تم لوگوں کو سیکھنے سمجھنے کے لئے اپنے ذہن و دل میں اُس کتاب کو کھلی رکھنا چاہیئے۔

میرے والد جناب نور محمد خان صاحب عرف پٹھان میاں مرحوم ہاکی کے بہت مشہور پلیئر تھے۔ ان کی ہاکی پر کہی ہوئی نظم اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھی اور ہاکی کے ترانے کے روپ میں گائی جاتی تھی 'ہاکی کے استاد نے کس غضب میں ڈالا ہے'۔

وہ اپنی بہادری میں بہت مشہور تھے۔

اسی طرح والد صاحب ایک بہترین شکاری کی حیثیت سے بہترین مقام بھی رکھتے تھے انہوں نے زخمی شیر سے مقابلہ کیا تھا اور جیت انہیں کے حق میں ہوئی تھی ۔ اُس وقت بھوپال کے آخری حکمراں نواب حمید اللہ خاں صاحب کے داماد نواب سرور علی خاں صاحب کوروائی ، نواب عابدہ سلطان صاحبہ کے شوہر شیر کے شکا ر میں میرے والد کے ساتھ موجود تھے۔

میرے ذہن میں ہمیشہ اُن شخصیات کے نام روشن رہتے ہیں جس کے فیضان سے میں نے ادبی دنیا سے اپنا رشتہ استوار کیا جناب اختر سعید خاں صاحب جناب اظہر سعید خان صاحب محترم ہستیاں تھیں ۔ اُن کا گھر میرے گھر کے مقابل ہی تھا۔ ساتھ میں میرے تایا زاد بھائی شریف فکری صاحب کے صاحبزادے ۔ سپاہی بہادر کے مصنف جناب اسد اللہ خاں صاحب اور جناب شاعر اشرف ندیم صاحب و بہن برجیس انجم وحسن بانو تبسم وغیرہ کے ساتھ رہ کر ادبی شعری اور علمی فضا میں سانس لیتی رہی ۔ اسد بھائی مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ ایک دن تم ضرور ادیبہ بنوگی۔

آج جبکہ میری دوسری کتاب شائع ہونے جارہی ہے میں شدت سے ان کی کمی محسوس کر رہی ہوں محترم بھائی اشرف ندیم صاحب نے میری دونوں کتابوں کے وقت مجھ کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور ہر طرح میری ادبی کاوشوں میں مدد فرمائی ہے۔

میری استاد محترمہ شفیقہ فرحت صاحبہ نے میری اعلیٰ تعلیم کی ابتدا میں مجھے علم وادب کو سمجھنے کا شعور عطا کیا ۔ تعلیم کے آخری حصے میں جناب پروفیسر آفاق احمد صاحب میری علمی وادبی کاوشوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہنمائی فرماتے رہے ہیں ۔ آپ نے میری یہ کتاب ''احساس کے دریچے'' بھی پڑھی اور تبصرہ کرتے ہوئے آئندہ کے لئے مجھ سے امیدیں وابستہ کی ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر نصرت بانو روحی صاحبہ جو سماج کی فلاح و بہبود کے کاموں میں اپنی زندگی وقف کئے ہوئے ہیں۔ ادبی محفلیں و نشستیں بھی ان سے خالی نہیں ہیں۔ وہ خواتین کی ادبی انجمن ''بزم سب رنگ'' کی صدر ہیں۔ آپ نے میری کہانیوں وافسانوں کو ہر ہر زاویئے و پہلو سے سُنا پڑھا و سمجھا ہے اور میری کوششوں کو بہت سراہا ہے اور میرے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔

اسی طرح محترمہ پروفیسر کوثر جہاں صاحبہ نے میرے افسانوں پر بہت خوبصورت طریقے سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ بہترین افسانہ نگار ہونے کی بنا پر حالات واقعات ومعاملات کو بغور پڑھ کر پیارے انداز میں رائے زنی کی ہے۔

محترمہ ڈاکٹر انیس سلطانہ صاحبہ نے جو میری استاد بھی رہی ہیں میری کہانیاں پڑھیں سمجھیں، اپنی رائے کا اظہار کیا اور میری ادبی سرگرمیوں کو سراہا ہے۔

محترم جناب اقبال مسعود صاحب نے بھی میرے افسانوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالی، میری اور میری کہانیوں کی قدر و منزلت فرمائی ہے۔

میں محترم جناب پروفیسر آفاق احمد صاحب محترمہ پروفیسر کوثر جہاں صاحبہ اور محترمہ ڈاکٹر نصرت بانوں روحی صاحبہ ڈاکٹر محترمہ انیس سلطانہ صاحبہ اور بہترین نقاد جناب محترم اقبال مسعود صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور ان سب کے لئے بہتر صحت اور درازئ عمر کے لئے دعا گو ہوں۔ تا کہ انکے سائے میں ہم ان سب کے وجود سے کامیابی و کامرانی پاتے رہیں اور ہمارے ادب کے خزانے ان کی تحریروں سے ہمیشہ مالا مال ہوتے رہیں۔ (آمین)

☆☆

فیروزہ یاسمین

A-174, H.B Colony Koh-e-Fiza, Bhopal

Ph. 2547861

ایک کتاب اور احساس کے دریچے

اقبال مسعود

افسانے کا موجودہ روپ ہمارا قدیم ترین ورثہ ہے جو بے شمار مراحل سے گزر کر ہم تک پہونچا ہے۔ افسانہ انسانی زندگی سے وابستہ اور اسی زندگی کا رہین منت ہے، منطقی طور پر اس کی بنت میں سماج کی عکاسی اور انسانی ارتقا کی داستان پوشیدہ ہے۔ کہانی خود زندگی ہے زندگی کی طرح پر اسرار اور رنگا رنگ، کہانی زندگی پر تنقید بھی ہے اور تعمیر بھی، اس کا اظہار لفظ کا محتاج ہے۔ افسانہ نگار اپنے پس منظر، استعداد، علم، مطالعہ، مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر افسانے میں رنگ آمیزی کرتا ہے، کہانی گڑھتا ہے یا حقیقی واقعہ کو کہانی کا روپ دیدیتا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے ہمیشہ زندگی کی عکاسی کی، عصری صورتحال کو پیش نظر رکھا اور فنی بصیرت کے ساتھ اظہار کیا۔ اردو افسانہ اپنی نوعمری کے باوجود دنیا کے بہترین افسانوں کا مقابلہ کرسکتا ہے اردو افسانہ نگاروں کی طویل فہرست میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین فنکار بھی نمایاں ہیں اور کئی کے نام آفتاب ومہتاب کی طرح چمک رہے ہیں۔ تاہم ذاتی طور پر فنکاروں کے زنانہ اور مردانہ ریزرویشن کے خلاف ہوں اس کو تحسین سخن کی راہ میں مانع کرنے کو ادبی بددیانتی سمجھتا ہوں تخلیق اگر ستائش کے قابل ہے تو اس میں مرد عورت کی تخصیص خلاف انصاف ہے۔

فیروزہ یاسمین تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں ان کے خاندان میں

ادیبوں، فنکاروں، اور شاعروں کی کہکشاں سجی ہوئی ہے۔ ان کا لکھنے کی طرف رجحان قطعی تعجب کا باعث نہیں ہے۔ وہ اگرچہ طبقۂ اناث سے تعلق رکھتی ہیں مگر Femin ism (فیمن ازم) کی اس طرح ہمنوا اور دم ساز نہیں کہ خواتین اپنے آنچل کو پرچم بنالیں یا شمع محفل بن کر رہ جائیں۔ وہ عورت کو نہایت اعلیٰ وافضل مقام پر فائز کرتی ہیں جو نسلوں کی تربیت کرتی ہے جو زبان کو ادب کا آئینہ بنادیتی ہے جو اخلاق اور تہذیب کی نمائندہ ہوتی ہے۔ وہ بے شرمی، بے حیائی اور عورت کے بازار کی چیز بن جانے کے خلاف ہیں جو تعلیم وعلم کی جویائی ہیں اور خواتین کے لئے علم کو لازمی سمجھتی ہیں کہ بغیر تعلیم نہ وہ خود شناس بن سکتی ہے نہ اپنے حقوق سے آگاہی حاصل کرسکتی ہے اور نہ دنیا میں اپنے وجود کی جنگ لڑسکتی ہے۔ اس سلسلے میں روشن خیالی اور مغرب زدگی میں بپا کی گئی خواتین کی نام نہاد آزادی کی تحریکوں کے بارے میں امریکی ادیبہ Barbra Sheterman کی ہم خیال ہیں جس نے بغیر غور وفکر کے Femin ism کی طرفداری کرنے پر بیٹی فرائیڈن کی کتاب پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس نے مغربی خواتین کو راہ مستقیم سے ہٹا کر آوارہ خرامی اور بے راہ روی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اس کے مطابق ''مغربی جمہوریت میں آزادی کے معنی حسن کی نمائش اور عورتوں کو رونق محفل بنائے رکھنا ہے'' اس رویے نے معاشرے کو Consumer ism کا غلام بنادیا ہے۔ اب بدکردار خواتین بازار کی کموڈیٹی بن گئی ہیں۔ دیگر اجناس کی طرح اِن کی بھی قیمت طے کی جاتی ہے۔ انھوں نے رشتوں کی حرمت ختم کردی ہے رشتے لائق توقیر نہیں رہے۔ واضح رہے کہ عورت کا وجود بازار کی چیز نہیں ہے اس کے وجود کا تصور رشتے ناطوں کے

بغیر ممکن نہیں فیروزہ یاسمین انہیں خیالات ونظریات کی عکاسہ ہیں ان کا ایمان ہے کہ عورت اور مرد سچے رشتوں میں بندھ کر ایک معاشرہ تشکیل دیتے ہیں، عشق وحسن کی بات بھی سچے جذبوں کے پانیوں سے دھل کر پاکیزہ اور محترم لگنے لگتے ہیں۔

فیرزہ یاسمین کی کہانیوں میں رشتوں کی شکستگی کا موضوع بار بار عود کر آتا ہے وہ بار بار اس موضوع کو نئے پیرایہ سے بیان کرتی ہیں۔ارمانوں کا خون،ان دنوں سے یہ دن اچھے ہیں۔ہلچل،انتظار،تصویریں، جو وہ چاہیں گے،اصغری پورے ہوئے خواب، کیا میں نے غلطی کی، وغیرہ کہانیوں کے کردار متوسط معاشرے میں رشتوں کی شکست وریخت،اخلاقی زوال، بے روزگاری، بیکاری اور جہالت سے نبرد آزما ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں،آرزوئیں اور خواب ہیں۔پورے ہوئے خواب، کی فرزانہ جو شہر میں شادی کی آرزومند تھی جب اس کی آرزو کی تکمیل نہ ہوسکی تو خود وہ اپنی بیٹی کی شادی شہر میں کرانے کی شکل میں دیکھنے لگی کیا میں نے غلطی کی، میں سلمیٰ جوان بیوہ ہے وہ سوچتی ہے کہ "جوان عورت بے مرد کے لاوارث سرمائے کی طرح ہوجاتی ہے، چنانچہ دوسری شادی کرلیتی ہے تب سماج اس پر لعن طعن کرتا ہے اور وہ سوچتی ہی رہ جاتی ہے کہ کیا میں نے غلطی کی، "انتظار" ان دنوں سے یہ دن اچھے ہیں" "گرل" اور برقعہ نہ ملا معاشرے کے بے روزگار، بدکردار، کاہل وسُست مردوں کی عکاسی ہے جو محنتی خواتین کی زندگی دکھ، غم اور طعنوں سے بھر دیتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں خواتین کے مسائل کے علاوہ چند افسانوں میں معاشرے کی ہم آہنگی، انسانی نفسیات اور سماجی ناہمواریوں پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔واہ کلیم میاں، خوبصورت آنکھیں، اور آپ کیوں شرمندہ ہیں" "ضدی لڑکی" "میں اب تم سے......" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

فیروزہ یاسمین اپنے افسانوں کو بلاوجہ طوالت نہیں دیتیں بس کہانی بیان کرتی چلی جاتی ہیں اور اہم بات یہ کہ کہانی کے اندر کہانی پوری طرح موجود ہوتی ہے جو اس کو قابل مطالعہ بناتی ہے۔کہانی کے اندر سے جب کہانی غائب ہوجاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ساری تاثیر بھی ختم ہوجاتی ہے ان کی کہانی الفاظ وعلامات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی نہیں بلکہ مسلسل آگے بڑھتی ہے اور واقعات کے ذریعہ کہانی کو قدم بقدم آگے بڑھاتے ہوئے منطقی انجام تک پہونچادیتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کا پلاٹ مع تفصیل وجزیات کے ان کے ذہن میں ابتدا سے ہی واضح ہوتا ہے اور اس کے مختلف مراحل کی تلاش میں انہیں ٹھوکر نہیں کھانی پڑتی تاہم اس طرح کہانی میں ایک قسم کا جامد پن پیدا ہوجاتا ہے، جو کرداروں کی قدرتی نشوونما پر قدغن لگادیتا ہے اس طرح کرداروں کے خود آگے بڑھنے اور واقعات سے نبرد آزما ہونے کے مواقع کم ہوجاتے ہیں اس لئے کہ وہ کردار کی انگلی پکڑ کر نہیں چلتیں اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ فیروزہ یاسمین کی تخلیقی کائنات محدود ہوجاتی ہے بلکہ بعض جگہ واقعات حقیقت سے متصادم نظر آتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے صفت راوی کا بنا لیا ہے چنانچہ ان کا کام واقعات سنانا ہے اور وہ سناتی چلی جاتی ہیں اور یہ ہی ان کا کمال ہے۔

فیروزہ یاسمین کے افسانوں کی زبان آسان وسہل ہے اپنا مافی الضمیر بخوبی ادا کرتی ہیں۔افسانوی ادب کی تخلیق میں ابلاغ کا سلسلہ سب سے زیادہ توجہ طلب ہے اگر قاری کی توجہ مطلوب ہے تو ابلاغ کی باریکیوں پر توجہ دینی ہوگی۔سادہ الفاظ عام بول چال کی زبان اور سامنے کے واقعات پر نظر رکھنا پڑے گی۔فیروزہ یاسمین

کے یہاں گنجلک، انتشار، اور پریشان بیانی نہیں ہے افسانوں میں قصہ پن موجود ہے کہانی کا آغاز درمیان اور نقطۂ عروج بھی ہے کردار نگاری بھی، (البتہ کرداروں کی علیحدہ علیحدہ شناخت دشوار ہے کہ یہ سب ایک ہی جیسے دکھتے ہیں) مکالمات، سجل، صاف شفاف ہیں افسانوی پس منظر بھی ہے اور انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی بھی موجود ہے اور نہ ہی کسی جگہ الجھن ترکیبی تنافر اور لسانی تشکیلات کے چکرانے والے گھماؤ قاری کے لئے باعث اُلجھن بنتے ہیں۔

اگر چہ نئی صدی کی آمد نے عظیم روایات اور انسانی وراثت کو شکست وریخت سے دوچار کردیا ہے۔ ذہن کی کشمکش ہے، بے چینی ہے، فکر مندی ہے، جو معاشرے کے انتشار کی بے توقیری اور انسان کا اور اُن کے جزئیات کا بازار کی کموڈیٹی بن جانے سے ہر حساس فرد، بیدار مغز انسان اور فکر مند خاتون میں بیدار ہو جاتی ہے۔ لیکن سیکڑوں افراد اپنی تکلیف اور بے چینی کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں مگر فیروزہ یاسمین کو قدرت نے ذہن رسا، حساس دل، سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی قوت اور لکھنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ اپنے جذبات کا اظہار کرسکیں اور وہ انہوں نے اس طرح کیا کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ یہ ہی تو میں کہنا چاہتا تھا۔

اقبال مسعود

بان گنگا اُردو اکیڈمی مدھیہ پردیش،

بھوپال

☆

ڈاکٹر نصرت بانو روحی

تعارف

محترمہ فیروزہ یاسمین بھوپال کے ادبی حلقوں میں خصوصی طور سے خواتین ادیباؤں کے حلقے میں جانی مانی معروف و ہر دل عزیز شخصیت ہیں۔ادیباؤں کی شاید ہی کوئی ایسی انجمن ہو جس کی وہ ممبر نہ ہوں۔'دھنک' کی وہ ایک اہم رکن تھیں۔ آج کل 'سب رنگ' کی سکریٹری ہیں۔

زیرِ نظر کتاب فیروزہ یاسمین کی دوسری ادبی کتاب ہے اس سے پہلے وہ بھوپال کے قابل فخر شاعر و دانشور جناب اختر سعید خاں صاحب پر تحقیقی مقالہ شائع کر چکی ہیں جو ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہُوا۔زیرِ نظر کتاب افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جو محترمہ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ان افسانوں اور کہانیوں کے وسیلے سے محترمہ نے اپنی بات سماجی اور ادبی حلقوں میں پہونچانےِ کی کوشش کی ہے اگرچہ یہ کہانیاں بہت مختصر ہیں اور بیجا طوالت سے محفوظ ہیں لیکن بے حد بامعنی ہیں۔

ان میں ایک سماجی اور اصلاحی پیغام ہے۔مثلاً برقعہ نہ مِلا، ، آپ کیوں شرمندہ ہیں، واہ کلیم میاں، یہ نہ تھی ہماری قسمت، کیا میں نے غلطی کی ، ارمانوں کا خون، لڑکے والے، کوٹھی تیار ہوئی، بے حد پُر مغز کہانیاں ہیں جن میں سماجی، اصلاحی سوالوں کو اُٹھایا گیا ہے۔ میری رائے میں خواتین کو بالخصوص اِن کہانیوں کو پڑھنا

چاہئے۔اور مصنفہ کے قیمتی پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ان کہانیوں میں فرقہ وارانہ اتحاد، قومی یکجہتی ،محنت کش طبقہ کی محرومی ویاسیت ، ان کے ساتھ انسانی سلوک کی حمایت کے علاوہ طلاق ومتعدد شادیوں کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کہانیاں عام روش سے ہٹ کر ہیں۔ان میں بے حد اختصار سے کام لیا گیا ہے اور بے جا تفصیلات سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ آج کے بے حد مصروف زمانے میں بھی لوگ ان سماجی مسائل پر غور کر سکیں۔اور محترمہ یاسمین کے پیغام کو پڑھ سکیں۔اختصار کے باوجود تحریر پُر اثر ہے اور پڑھنے والے کے دماغ پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔خواتین کے مسائل اُٹھا کر انہوں نے جس طرح ایک ترقی پسند نظریہ پیش کیا ہے وہ مصنفہ کی خواتین میں ہر دلعزیزی میں مزید اضافہ کر دے گا۔

میری نیک خواہشات محترمہ فیروزہ یاسمین کے ساتھ ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لگاتار خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں رہیں گی۔اور ایک دن آسمانِ ادب پر روشن ستارہ بن کر چمکیں گی۔

مورخہ: ۱۷ر نومبر 2008ء

☆☆

ڈاکٹر نصرت بانو روحی

نزد پی جی بی ٹی کالج روڈ، بھوپال

کوثر جہاں کوثر

قومی یک جہتی کی عکاس فیروزہ کی کہانیاں

فیروزہ یاسمین کی کہانیاں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی داستان گو زندگی کے ہر پہلو پر کہانیاں سنا رہا ہے۔ تمام کہانیوں میں ان کا انداز بیانیہ ہے اور گہرے مشاہدے کی غمازی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ان کی کہانیوں میں قومی یک جہتی کی اچھی عکاسی موجود ہے۔ ہندوستان کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں ہندوستانی تہذیب کی تصویر اپنے رنگا رنگ انداز سے ہمیں روشناس کرتی ہے لیکن خاص طور پر بھوپال میں ہماری ملی جلی تہذیب کا رنگ بہت گہرا ہے۔ اس گنگا جمنی رنگ کو فیروزہ نے بہت ہی سادگی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی طرح سماج میں پھیلی ہوئی بہت سی برائیوں پر بھی انہوں نے اپنی نظر ڈالی ہے اور سماجی مسائل پیش کئے ہیں۔ عورت اگر کم عمری میں بیوہ ہو جائے تو سماج میں عزت کے ساتھ زندگی گذارنا دشوار ترین مرحلہ ہوتا ہے بیوہ عورت کی زندگی کا مشکل ترین وقت اسے مستقبل کی فکر اور بسر اوقات کی سختیوں سے دوچار کرتا ہے اس مسئلے کو بھی فیروزہ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

شادی شدہ زندگی کے مسائل بھی انہوں نے مخصوص انداز میں پیش

کیے ہیں۔

ان کی کہانیاں پڑھ کر شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اپنے مشاہدہ کو انہوں نے اپنے زورِ قلم سے رنگا رنگ انداز میں ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ ان کے قلم میں روانی اور برجستگی ہے۔ جو ادب پارے کے لئے ضروری ہوتی ہے ان کی کہانیاں ہم کو وقت کے ہر ایک دور میں لے جاتی ہیں۔ آج کل زندگی کے ہر شعبے میں خواتین پیش پیش ہیں تو ادب میں بھی ان کی حصے داری بڑھ گئی ہے اور بڑے بڑے نام اس ادبی سفر میں شامل ہو گئے ہیں۔

فیروزہ یاسمین بھی اس ادبی سفر کے سمندر میں اپنی ادبی اہمیت کا احساس کراتی نظر آتی ہیں۔

امید اور نیک خواہشات کے ساتھ ان کے ادبی سفر کو جاری رکھنے کی دُعا کرتی ہوں۔

کوثر جہاں کوثر

H.N.786 New. Colony Garhi Road,

Khanu Gaon Bhopal

ڈاکٹر انیس سلطانہ

میری شاگرد فیروزہ یاسمین

احساس کے دریچے جب کھلتے ہیں تو ایک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے جیسے خوشگوار ہوا کے معطر جھونکے دل ودماغ کو تازگی بخشتے ہیں۔فن کار کا خلوص اور قاری سے کمٹمینٹ نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔

فیروزہ یاسمین اس سے قبل اپنے مقالہ ''اختر سعید خاں شخصیت اورفن'' کی اشاعت کے ساتھ ادبی دنیا کے ایک گوشہ میں اپنا مقام بنا چکی ہیں اوراب ''احساس کے دریچے'' وا کرنے کے بعد اپنے حساس دل کے دھڑکنے اور قلم کے شعور اور دل کی سادگی کا ثبوت بھی دے رہی ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں روز مرّہ کے مسائل اور موضوعات کو انہوں نے اپنی مختصر کہانیوں کا موضوع بنایا ہے وہ مذہبی رواداری ہو یا ہندو مسلم ایکتا سماج کی فرسودہ رسمیں اور بوسیدہ روایتیں ہوں یا انسانیت کے ناپیدا کنار لمحات اوران کا تنوع ہو اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مسائل اور کیفیات۔ ان کی مختصر کہانیوں کا موضوع بنے ہیں انہوں نے سادہ بیانی اوراختصار کے ساتھ افسانوی عمل کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی بات کہی ہے۔یہ ان کے افسانوں کا امتیاز ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان کے افسانے پڑھنے والوں کی توجہ ضرور کھینچیں گے۔

فیروزہ یاسمین میری شاگردہ رہی ہیں یہ اپنی طبیعت اور طرز عمل کی وجہ سے نمایاں مقام

بھی رکھتی ہیں اور زندگی کے تلخ وشیریں لمحات سے گزر کر اپنے تجربات اور مشاہدات کو بیان کردینے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔

زیرِنظر مجموعے میں ان کے دل کا خلوص جذبہ کی صداقت اور مزاج کی سادگی کارفرما ہے۔ میں ان کو افسانوی دنیا میں داخل ہونے پر مبارک باد دیتی ہوں اور ادبی دنیا میں ان کے روشن مستقبل کی امید کرتی ہوں۔

☆☆

ڈاکٹر انیس سلطانہ
موتی مسجد، بھوپال

"فیروزہ یاسمین نے دھنک میں غزلیں بھی پڑھیں، افسانے بھی پڑھے سب نے سُنے اور ان کے قلم کو آہستہ آہستہ پختگی حاصل ہوتی گئی۔ دھنک میں نئی لکھنے والیوں کے ساتھ ساتھ قرۃ العین حیدر جیسی عالمی شہرت یافتہ ادیبہ جیلانی بانو، عصمت چغتائی، رفیعہ منظور الامین بھی شامل ہو چکی تھیں۔ ہندی اور مراٹھی کی لکھنے والیاں مہر النسا پرویز، مالتی جوشی نے بھی اس میں پڑھا ہے۔ پھر بھلا بتایئے فیروزہ کا قلم کیسے رواں نہ ہوتا۔ اور پختگی اور حسن حاصل نہ کرتا۔"

بھوپال، ۱۰/مارچ ۲۰۰۵ء۔

پروفیسر شفیقہ فرحت

نوٹ:- یہ اقتباس مقالہ "اختر سعید خاں شخصیت اور فن" سے لیا گیا ہے جو پروفیسر شفیقہ فرحت صاحبہ نے اپنے مضمون "میری شاگرد فیروزہ یاسمین" میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ مقالہ پروفیسر آفاق احمد صاحب کے زیرِ نگرانی ۱۹۸۴ء میں لکھا گیا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں شائع ہُوا۔

احساس کے دریچوں پر ایک نظر

فیروزہ یاسمین میں اُردو ادب سے جو لگاؤ ابتدا سے رہا ہے وہ خداداد ہے ان کے خاندان کے ادبی ماحول نے اس لگاؤ کو مہمیز کیا ہے۔

اس افسانوی مجموعے سے قبل قارئین نے فیروزہ کی پہلی تصنیف ''اختر سعید خاں شخصیت اور فن'' ملاحظہ کی ہوگی۔ اس پہلی کتاب سے ہی ان کی نثری صلاحیتیں اُجاگر ہوگئی تھیں۔ اس کتاب کو اُردو کے قارئین نے پسند بھی کیا تھا۔

اب ان کی دوسری تصنیف ''احساس کے دریچے'' آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ ان افسانوں میں مصنفہ نے سماج کے مختلف بگاڑ کو سامنے رکھ کر سُدھار کے مقصد کو اپنے ذہن میں برقرار رکھا ہے۔

افسانے اور حقیقت میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار کو کبھی حقیقت کو افسانے کا رنگ دینا ہوتا ہے اور کبھی افسانے کو حقیقت بنانا ہوتا ہے اور یہی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے جب اس کے قلم کو آزمائش سے گذرنا ہوتا ہے۔

زیرِ نظر افسانوں میں اس آزمائش سے فیروزہ کس خوبصورتی یا کامیابی سے گذری ہیں یہ فیصلہ تو قارئین اور ناقدین کریں گے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ انھوں نے رنگارنگ موضوعات سے سرشار کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ اپنی شگفتگیٔ بیان اور دلچسپی کے لحاظ سے پڑھنے والوں کو ضرور متاثر کریں گی۔ مثال کے طور پر ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' اور ''واہ کلیم میاں'' طنز و مزاح کے رنگ میں اچھی کہانیاں ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ فیروزہ اپنے افسانوی عمل کو بدستور جاری رکھیں گی۔ نیز خوب سے خوب کی طرف پیش قدمی کرتی رہیں گی۔ میری دُعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔

بھوپال — مخلص

۲۱ر جنوری ۲۰۰۹ء — اشرف ندیم بھوپالی
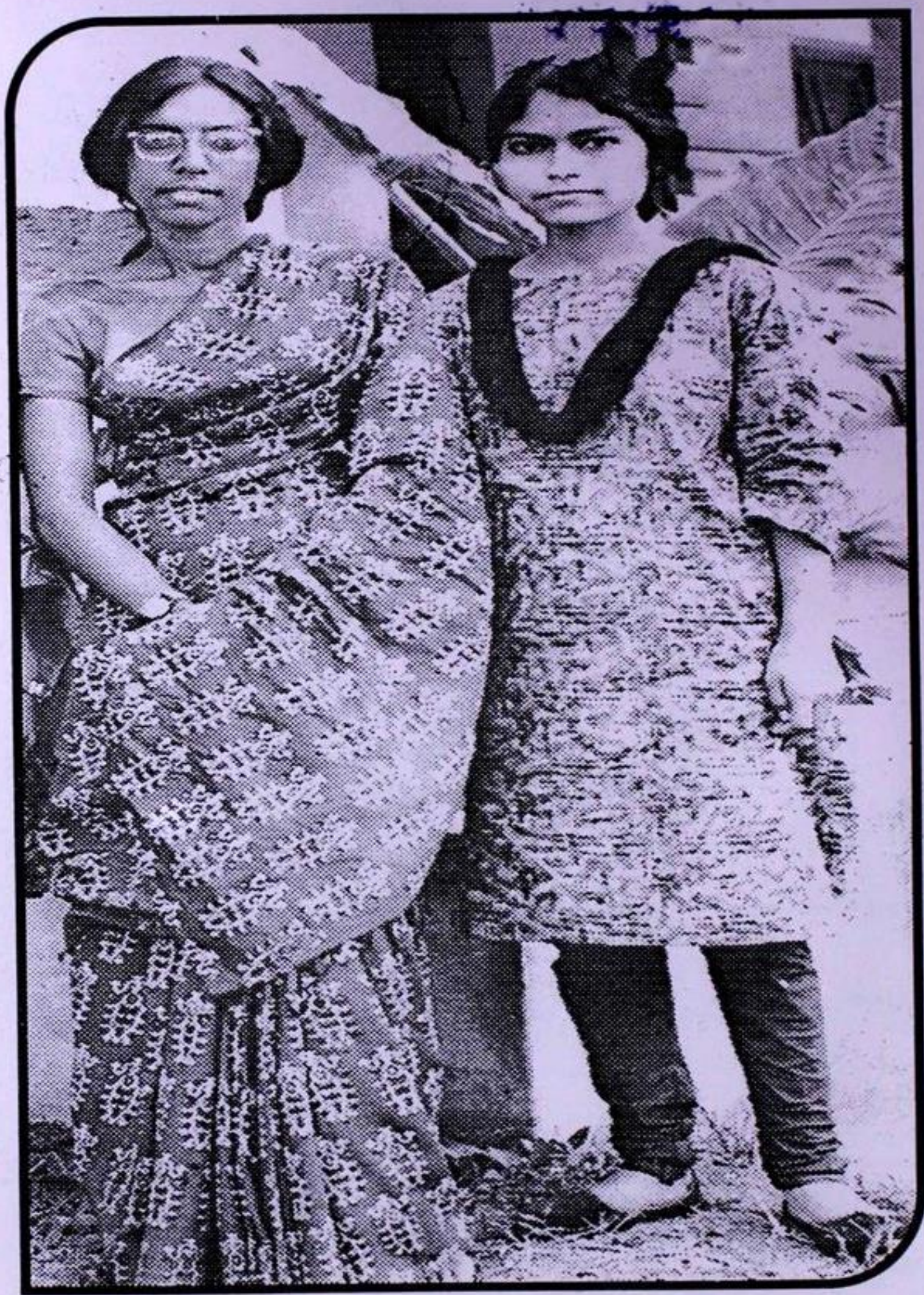
فیروزہ یاسمین، پروفیسر شفیقہ فرحت صاحبہ

دُنیائے اُردو ادب کی معروف ادیبہ اور طنز و مزاح نگار پروفیسر شفیقہ فرحت صاحبہ گر چہ مرحوم ہو چکی ہیں لیکن اُن کو مرحوم لکھنے کو دل نہیں چاہتا آپ کی تحریریں اہلِ ادب کے خزانوں میں محفوظ رہیں گی اُن کے قلم کی روشنائی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

فیروزہ یاسمین، حِنا حق، پروفیسر شفیقہ فرحت صاحبہ، صہبا حق

محترمہ شفیقہ فرحت آپا صاحبہ نے خواتین کی ادبی انجمن 'دھنک' کے ذریعہ خواتین میں ادب کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ کئی جھرنیں پھوٹے، نغمے گونجے اور صحرا میں بکھرے ہوئے افسانے یکجا ہُوئے۔ خدائے پاک برتر و بزرگ سے دُعا ہے کہ محترمہ آپا کی مغفرت فرمائے اور اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں مقامِ اعلیٰ عطا فرمائے۔

دائیں سے بائیں : میئر جناب سنیل سود صاحب، محترم اختر سعید خاں صاحب، فیروزہ یاسمین محترمہ، رضیہ حامد صاحبہ

بوقت اجراء : "اختر سعید خاں شخصیت و فن" ٹی۔ ایم۔ کانوینٹ اسکول

بزمِ "سب رنگ" کی ایک نشست فیروزہ یاسمین کی رہائش گاہ پر۔

سلطانہ حجاب، پروفیسر شفیقہ فرحت صاحبہ، پروفیسر شیمم علیم صاحبہ، سیتا باجپئی، محترمہ ڈاکٹر نصرت بانو روحی (صدر بزمِ سب رنگ)، رعنا مہندی، فیروزہ یاسمین، پروفیسر شیمم علیم

(دائیں سے بائیں)
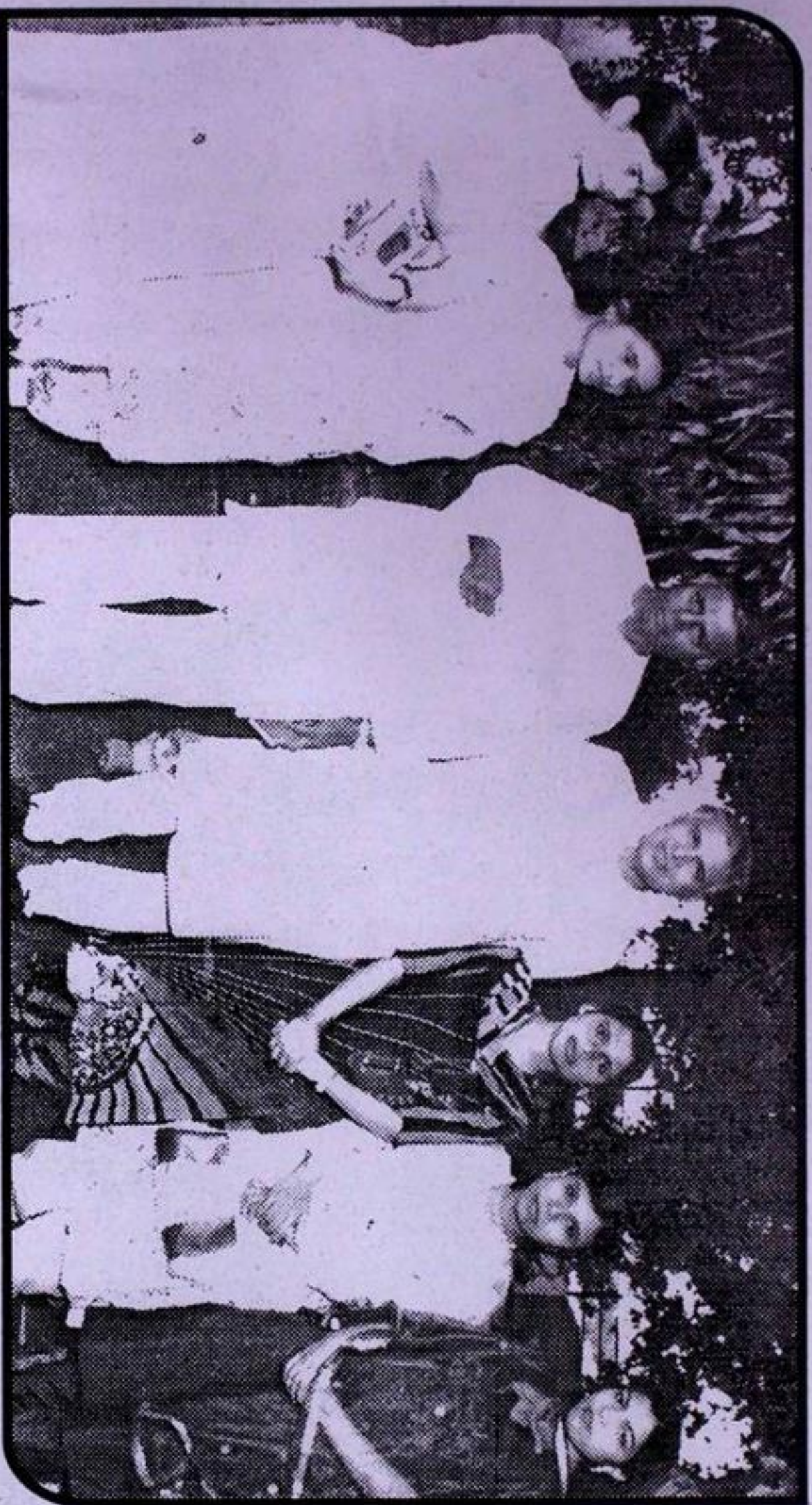
دائیں سے بائیں صوفیہ، نصرت، شاہین، پروفیسر آفاق احمد صاحب، محسن بھوپالی، نفیسہ، فیروزہ یاسمین
(ایم.ایل.بی.کالج کا یادگار فوٹو)

(دائیں سے بائیں) ہمشیرہ شاہینہ زرین، سمن اسد، برجیس انجم، پروفیسر حبیب فخری، ہما فخری، اختر سعید خاں، عین الحق خان (شوہر فیروزہ یاسمین)، صہبا حق، فیروزہ یاسمین (عمیر، طلحہ، سعد، مُعید، آمنہ، علینا، اقصیٰ، بادِل)

آپ کیوں شرمندہ ہیں

مسعود حسین خان ناگپور کے قریب ''ہنگنا'' نامی ایک گاؤں میں ڈاکٹر تھے۔ اگرچہ وہ ایم۔پی کے رہنے والے تھے لیکن ان کی سروس مہاراشٹر سے ہی شروع ہوئی تھی۔ مسعود حسین ''خان صاحب'' کہلاتے تھے۔

مسعود حسین خاں کی دوستی یہاں شرما صاحب سے ہوگئی۔ شرما صاحب برہمن سماج سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ فیملی پلاننگ آفس میں سروس کرتے تھے۔ شرما صاحب کے گھر میں ان کے بزرگ والدین اور خوبصورت پتنی رہتی تھیں۔ شرما صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ مسعود حسن خاں اپنے شہر سے شادی کرکے اپنی بیوی کو یہیں لے آئے تھے۔

خان صاحب اور شرما صاحب دونوں کی بیویوں میں بہت دوستی ہوگئی وہ دونوں ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہتیں۔ سارے پروگرام میں ساتھ شریک رہتیں۔ تمام لوگ ان کی دوستی کو رشک کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ شرما صاحب کی والدہ پُرانے وفرسودہ خیالات کی تھیں، لیکن اپنے بیٹے کی خاطر اپنے تمام پُرانے خیالات کو ترک کر چکی تھیں وہ بھی خان صاحب کی محبت وخلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں وہ ان سے بھی اپنے بیٹے کی طرح محبت کرنے لگیں یہاں تک کے اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھوجن بھی کرواتیں۔ شرما صاحب ان کے اکلوتے بیٹے

تھے جو بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

کچھ سال بعد شرما صاحب نے سروس چھوڑ دی اور ناگپور میں بڑے پیانے پر ہارڈویر کا بزنس کرنے لگے۔خان صاحب ہر ساتویں آٹھویں دن شرما صاحب سے ملنے جاتے۔اس طرح دونوں دوست ہمیشہ ملتے رہتے اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آتے جب خان صاحب اپنی مسیز (اہلیہ) کو لیجاتے تو شرما صاحب کے گھر پر ہی ٹھہراتے اگر چہ ان کا گھر زیادہ بڑا نہ تھا لیکن ان کی تاکید یہی تھی۔دھیرے دھیرے خان صاحب کے یہاں ایک کے بعد ایک دو بیٹیاں پیدا ہوگئیں پھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔بیٹا پانچ سال کا ہوگیا تھا۔

ایک بار عید کے موقع پر دو دن پہلے خان صاحب اور ان کی بیوی 'ممکنا'' سے شاپنگ کے لئے ناگپور آئے۔رات بہت ہوگئی شدید سرد موسم تھا پھر راستے کی ٹھنڈی ہوائیں بچے کو بیمار کردینگی۔اس خیال سے شرما صاحب کی مسیز نے ان کے بیٹے جہانگیر کو ساتھ لے جانے کے لئے منع کیا۔جہانگیر بھی خوشی خوشی راضی ہوگیا۔ انہوں نے اس کو بہت لاڑ پیار سے اپنے پاس رکھا اس کے بچپن کی معصوم خوشبو سے ان کی ممتا کا آنچل مہک اٹھا۔ان کا دل جہانگیر کو پہونچانے کے لئے نہیں چاہتا تھا۔ پورا دن گذر گیا۔ادھر دوسرے دن عید ہوگئی۔

خان صاحب کی مسیز نے اپنے بیٹے کو یاد تو کیا لیکن ان کو شرما صاحب کی محبت پر پورا یقین تھا۔گیارہ بجے دن کو دیکھا کہ شرما صاحب جہانگیر کو لے کر آرہے ہیں۔جہانگیر نہایت خوبصور بچہ تھا نیا لباس سفید کلیوں کا کرتا اوپر سے پائجامہ کالی جیکٹ سلیم شاہی جوتا پہنے سر پر گول گوٹے والی ٹوپی لگائے ہوئے ہاتھ میں مٹھائی کا

ڈبہ کھلونے اور رنگ برنگے بیلون کے ساتھ خوشی خوشی چلا آرہا ہے۔گھر میں داخل ہوکر وہ چہک کر اپنے پاپا ممی سے بولا دیکھئے پاپا مجھ کو میرے چاچا نے کیا کیا دلوایا ہے۔میری چاچی نے صبح سے مجھ کو نہلا کر نئے نئے کپڑے پہنائے ٹوپی لگائی اور جوتے موزے پہنائے۔تیار ہوکر جب میں چاچا کے ساتھ باہر نکلا تو چاچا نے مجھ سے پوچھا بیٹا جہانگیر تمہیں نماز آتی ہے کیا تو نماز پڑھنے مسجد جائے گا؟میں نے کہا نہیں چاچا مجھے ابھی نماز نہیں آتی آگے چل کر چاچا نے مجھ کو بہت سارے کھلونے اور مٹھائی دلوائی میں آپ سب کے لئے بھی مٹھائی لے کر آیا ہوں۔مسیز خان جذبات سے آبدیدہ ہوکر بولیں شرما بھائی صاحب آپ نے جہانگیر کے لئے اتنا کچھ کیا ہے اس سے زیادہ دوستی اور محبت کی کیا مثال ہوگی۔

شرما صاحب نے کہا بھابی جی کیا جہانگیر میرے لئے میرے بچے کی طرح نہیں ہے؟آپ ایسے شبدوں سے میری محبت کو نہ تولئے۔مسیز خان کے دل سے دعا نکلی کہ اے اللہ پاک پروردگار تو شرما صاحب کو بھی اولاد کی خوشی سے مالامال کردے یہ دعا تیر کی طرح لگی۔ایک سال کے بعد شرما صاحب ایک خوبصورت بیٹے کے باپ بن گئے۔

تین سال بعد خان صاحب اپنی کچھ ذاتی خاندانی الجھنوں کی وجہ سے رزائن کر کے اپنے شہر اندور آگئے۔لیکن دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تقریباً ہر ماہ شرما صاحب بزنس کا کام نکال لیتے اور اندور خان صاحب اور ان کی فیملی سے ملنے آتے انکی مسیز بھی آتیں ایک دودن رک کر تفریح کر کے مل جل کر واپس ہو جاتیں۔

شرما صاحب کے بیٹے راہل کی سالگرہ ہر سال زور شور سے ناگپور میں منائی

جاتی انویٹیشن ضرور آتا ۔لیکن خان صاحب اپنی کلینک کی مصروفیت کی وجہ سے ہر وقت جانہیں پاتے تھے ٹیلیفون پر ہی مبارک باد دیتے رہتے ۔

جہانگیر اب تھوڑا بڑا ہوگیا تھا سب بچوں کا کہنا تھا کہ پاپا جی ڈاکٹر فیض انکل آپ کی کلینک پر بیٹھ جائیں گے اس بار آپ راہل کی سالگرہ پر ضرور چلے جائے۔اب کے ان کے یہاں بڑا پروگرام بھی ہے ۔ ہمیشہ چاچا ہی آپ سے ملنے آتے ہیں سب نہیں جاسکتے تو آپ اور ممی دونوں ہی ہوکر آجائے ۔ ہم سب دادی ماں کے ساتھ رہ لینگے ۔منّی اور گڈی بھی راضی ہوگئیں ۔شبانہ اور شاہین سب نے ہی مل کر اپنے پاپا ممی کی تیاری کردی ۔خان صاحب اپنی مسیز کے ساتھ سالگرہ سے دودن پہلے ناگپور پہنچ گئے ۔

وہاں ان کو دیکھ کر سب کی کلیاں کھل گئیں دونوں دوست بہت ہی خوش تھے ایک ساتھ بیٹھے اٹھے کھانا کھا کر دیر تک باتیں کیں پھر سو گئے ۔دوسرے دن خان صاحب جمعہ کی نماز ادا کرنے جامع مسجد گئے ۔بعد نماز کے نمازی باہر نکل رہے تھے اس وقت کیا دیکھا کہ دو مخالف گروپوں میں آپس میں تکرار ہو رہی ہے بات چیت میں جلد ہی گرما گرمی ہوگئی یہاں تک کہ مار پیٹ کی نوبت آگئی لوگوں نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا لیکن جو بھی سامنے آیا اس کو بہت ہی بیدردی سے مارا آنسو گیس چھوڑی گئی فائرنگ ہوئی بے گناہ لوگ مارے گئے اور اسی طرح ایک گولی خان صاحب کے سینے کو چھیدتی ہوئی آگے بڑھ گئی ۔

دن کے پانچ بج رہے تھے جب خان صاحب گھر نہ پہونچے تو شرما صاحب اسکوٹر لیکر مسجد کی طرف دیکھنے گئے انہوں نے دیکھا کہ وہاں بڑا غدر ہو رہا

ہے بہت سی لاشیں پولس کی بھیڑ بھاڑ کچھ زخمی سسکیاں لے رہے تھے کچھ مُردوں کے پاس کھڑے رو رہے تھے کچھ پولس والے خان صاحب کی ڈیڈ باڈی اٹھا کر گاڑی میں پوسٹ مارٹم کے لئے لے جا رہے تھے یہ منظر دیکھ کر شرما صاحب حواس باختہ ہوگئے ۔وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے یہ میرا متر ہے یہ تو میرا دوست ہے اس کو کس نے مار ڈالا یہ تو میرے مہمان تھے بہت اچھے انسان بالکل بے قصور میرے لئے بھگوان کی طرح تھے ان کے مرنے کی خبر کیسے بتاؤں گا بچوں کو سناؤں گا ان کا سامنا کرونگا دل و دماغ درد و غم پھٹا جا رہا تھا پھر بھی شرما صاحب نے ہمت سے کام لیا اور پولس سے منت وسماجت کر کے خان صاحب کی باڈی کو اپنے گھر پر لے آئے ۔وہ گھر جس میں کل ہونے والی تقریب کی سرگرمی سے تیاریاں چل رہی تھیں آج ماتم کدہ بن گیا تھا ۔شرما صاحب خان صاحب کی ڈیڈ باڈی لیکر گاڑی میں ان کے گھر اندور آگئے ۔جب گھر میں مسیز خان اور شرما صاحب داخل ہوئے تو بچے جھوم گئے اور خوشی سے کہنے لگے چاچا اور ممی آگئے چاچا پاپا کہاں ہیں یہ پوچھتے ہوئے وہ باہر کی جانب آئے گاڑی دیکھی اس گاڑی میں اپنے پاپا کی ڈیڈ باڈی !!!جہانگیر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا پاپا کو کیا ہوگیا ہے ؟ جلدی بتائے چاچا۔شرما صاحب نے بہت ہمت کر کے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو جنبش دی بیٹے جہانگیر تمہارے پاپا اب اس دنیا میں نہیں رہے !اب وہ ایک بہت ہی اچھی دنیا میں چلے گئے ہیں۔

جہانگیر بے سدھ ہوگیا تڑپ کر بولا نہیں چاچا آپ یوں ہی کہہ رہے ہیں آپ جھوٹ موٹ کہہ رہے ہیں چاچا ایسا کہیں ہوسکتا ہے بھلا ؟ گڑیا زاروقطار روتی

ہوئی بولی میرے پاپا تو باجی سے گھڑی لانے کا وعدہ کر کے گئے تھے اپّی کو سائیکل دینے کا کہا تھا ابھی ان کا تو رزلٹ بھی نہیں آیا میرے پاپا نے بڑی گڑیا لانے کا کہا تھا۔

شبانہ اور شاہنی زور زور سے پاپا پاپا کہہ کر رونے لگیں۔

شرما صاحب کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی وہ بڑی مشکل سے بولے میرے پیارے بچو میں تمکو سائکل گڑیا گھڑی کھلونے کپڑے اور بہت سی چیزیں لا کر دونگا بچے رونے لگے یہ کہتے ہوئے ''نہیں چاچا ہمیں کچھ نہیں چاہئے کچھ بھی نہیں۔ ہمارے پیارے بہت اچھے چاچا ہمیں تو ہمارے پاپا کی جان لوٹا دیجئے کئی بے ربط جملے بچوں کی زبانوں سے نکل رہے تھے۔

شرما صاحب کی آنکھیں غم اور غصے کی وجہ سے اوپر نہیں اُٹھ رہی تھی ان کا چہرہ زرد ہو گیا تھا ان کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش یہ دھرتی پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔گھر کے سارے لوگوں نے شرما صاحب کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا مسز خان نے شرما صاحب کے پاس آکر روتے ہوئے کہا۔''شرما بھائی صاحب جو ہوا ہے اس میں آپ کا کیا قصور۔؟

آپ کیوں شرمندہ ہیں؟

کیا میں نے غلطی کی؟

سلمٰی کی گود میں آٹھ دن کا بچہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی آغوش میں جنت کی فضاؤں میں گم تھا وہ معصوم بچہ نہ جانتا تھا کہ آج اس کا ابّو اسے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا و مافیہا سے رخصت ہوگیا۔ وہ جانتا بھی کیسے اتنا معصوم بچہ کسی بھی چیز کو نہیں سمجھ سکتا اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ! چلا آرہا تھا۔آنسو نہ تھمتے تھے چیخیں نکل رہی تھیں نہ آہیں نہ سِسکیاں پتہ نہیں اتنے آنسوں کہاں سے آگئے تھے جھڑیاں لگ گئی تھیں، سب بیویاں سر پہ ہاتھ رکھتیں بیٹی صبر کرو، حالانکہ ہر چشم پرنم تھی ہر دل میں درد سسکیاں اور آہیں۔

ماں کے پاس تین سالہ بچی آکر آنکھیں ملتی ہوئی کہہ رہی تھی امّی یہ سب کیوں رو رہے ہیں آپ بھی رو رہی ہیں کیوں؟ میں اسپتال جاکر ابو سے کہوں گی آج گھر میں خوب سارے لوگ آکر بیٹھے ہیں اور سب رو رہے ہیں۔ امی ابو کو ہسپتال سے چھٹی کب ملے گی؟ یہ سن کر اس کی امی کے آنسوؤں کی لڑیاں اور تیز رفتاری سے چلنے لگیں۔وہ اپنے آپ پر قابو نہ پاسکی روتے ہوئے بولی میرے بیٹی اب تیرے ابو کبھی نہیں آئیں گے تمہارے ابو ہم سب کو چھوڑ کر اللہ کے پاس چلے گئے ہیں جہاں سے واپس نہیں آتے۔ یہ سن کر بچی پہلے تو بولی چلو امی تو پھر اپن دونوں بھی منے کو لے کر ابّو کے پاس چلیں۔امّی نے جواب دیا مگر اللہ نے ہم کو نہیں بلایا اللہ ہمیں بھی بلا

لیتا تو اچھا تھا یہ سن کر بچی کی عجیب وغریب حالت ہوگئی۔ آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ دل بیٹھا جا رہا تھا؟۔ رونا نہیں آتا تھا بلکہ ذہن کے دریچے پھیل رہے تھے تصویریں گہری ہونے لگیں دل و دماغ میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ یہ تین سالہ لڑکی اب آٹھ سال کی معلوم ہونے لگی تھی۔

الماریاں کھلونوں سے بھری تھیں اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب کھلونے اس کو منہ چڑھا رہے ہیں اسے کسی کا ساتھ اچھا نہ لگتا تھا وہ بچوں کے ساتھ نہ کھیلتی بس وہ اپنے چھوٹے سے منّے کو بہلاتی رہتی اپنی امّی کے پاس بیٹھی رہتی ہر وقت آنکھیں سوچوں میں ڈوبی رہتیں وہ اس طرح اداس رہتی جیسے اس کی ساری خوشیاں اس کے ابّو کے ساتھ چلی گئیں۔ گھر میں سب ہی لوگ بیحد پیار کرتے اپنے بچوں سے زیادہ خیال رکھتے، دل بہلانے کی کوشش کرتے۔ خاص طور پر دادا دادی کی شفقت ملتی لیکن باپ کی طرف سے اس بچی کا دھیان نہ ہٹتا۔

آخر وقت نے مرہم لگایا اس کے خشک ہونٹوں پر کچھ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ اسکول جاتی سہیلیاں بن گئی پڑھائی ہونے لگی سلمیٰ ساس سسر کی دل و جان سے اپنے ماں باپ کی طرح خدمت کرتی بدلے میں اسے بھی محبت ملتی۔ وہ ساس کے نہانے کا کپڑوں و تیل کنگھی کا خیال رکھتی اور اس کی ذمہ داری نبھاتی۔ گھر میں سب اس کو عزت دیتے لیکن ایک جوان و خوبصورت لڑکی کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا۔ شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوگئی۔ 21 سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی جب کہ اس کی عمر کی کئی سہیلیوں کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ کیا زندگی اس حد تک محدود ہوکر رہ جائے گی اس کے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سب لوگ ہمدردیاں کرتے اس کے

قریب والوں نے کچھ عرصہ بعد دوسرے نکاح کا ذکر نکالا سلمٰی کبھی بھی اس بات پر راضی نہیں ہوئی اس کا خیال تھا کہ وہ دو بچوں کو پالنے میں ہی اپنی زندگی گذار دیگی۔ اس خیال سے وہ دوسرے نکاح کی بات نہ مانتی۔ آخر ساس کی خدمت اور گھر کے کام کاج میں کچھ ڈھیل آئی۔ کام کرتے کرتے وہ تھک چکی تھی اب اس کا بھی جی سجنے سنورنے کے لئے چاہنے لگا۔ سینما دیکھنے کو دل چاہتا رنگین کپڑے اچھے لگتے کبھی کبھی میکے جاکر مہمان رہ آتی آخر کہاں تک جوانی میں دل مارتی اور اپنے حسن کو کہاں تک چھپاتی جب وہ رنگین کپڑے پہنتی تو عورتیں اعتراض کرتیں پیٹھ پیچھے کہتی بڑی شوقین مزاج ہے کپڑے کیسے گہرے گہرے پہنتی ہے ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔ وہ چاہتی کہ سلمٰی غم کی تصویر بنی کاموں میں مصروف رہے پھر تو سب کو بڑی ہمدردی ہوتی وہ بڑی بھی معلوم ہوتی۔

مردوں نے اسے للچائی نظروں سے دیکھنا شروع کردیا وہ اپنے حسن کو چھپاتی شرم سے نگاہیں نیچے رکھتی لیکن پھر مردوں کی بیباک نظر اس پر پڑتی جو اس کو گراں گذرتی۔ یہاں تک کہ ایک دن رات کو جب اسے تنہا پایا تو جیٹھ نے دست درازی کی کوشش کی سلمٰی نے اپنا دامن بچا تو لیا لیکن اسکو اس بات کا احساس ہوگیا کہ جوان عورت بے مرد کے لاوارث سرمائے کی طرح ہوجاتی ہے جس پر جب جو چاہے اپنی نظر ڈال سکتا ہے اب سلمٰی نے دل میں ٹھان لیا کہ کوئی مناسب رشتہ ملنے پر نکاح کریگی تاکہ کوئی میری عزت سے نہ کھیل سکے۔

ایک شریف آدمی نے اپنے ساتھ نکاح کی تجویز رکھی۔ جب سلمٰی نیم راضی ہوگئی تو ماں بہت خوش ہوئی کہ اس کی معصوم بیٹی کی اجڑی ہوئی دنیا پھر سے آباد

ہوجائے گی اس کی ویران زندگی میں پھر ہل چل پیدا ہوگی مایوسیاں دور ہوکر پھر وہ نئی زندگی جئے گی ۔لیکن ساس کے تیور اب بدل گئے تھے جب سلمٰی نکاح کے لئے راضی ہوگئی تو سسرال والوں کو نکاح کرنے میں اختلاف ہوگیا سلمٰی میں جرأت پیدا ہوچکی تھی ۔اپنوں نے جب عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا اس وقت اسے کسی کا بھروسہ نہ رہا تھا۔

آخر میکے جاکر اس نے نکاح کرلیا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔نئے ساس سسر بھی خوش تھے وہ روشن دماغ تھے لیکن سلمٰی کے سسرال والوں نے اس طرح نگاہیں پھیرلیں کہ سلمٰی کی ساری خدمت بھلادی کچھ دنوں بعد اس سے اس کے معصوم بچے بھی چھین لئے ۔اس کو بہلا پھسلا کر اپنی طرف کرلیا۔جو سسرال والے سلمٰی کے ایک ایک حرکت پر فدا تھے ہمدردیاں کرتے تھے اس کی تعریفوں کے پل باندھتے تھے آج وہی سب سے زیادہ نالاں ہو گئے ۔برائی کے دفتر کھل گئے سب نے آنکھیں پھیرلیں اس لئے کہ اس نے نکاح کرلیا تھا وہ بھی اپنی مرضی سے۔

محفلوں میں چاروں طرف اُسے دیکھ کر لوگ چہ میگوئیاں کرتے اور کہتے کیا ضرورت تھی اُسے نکاح کرنے کی اسے تو دو بچوں ہی پر زندگی گذار دینا چاہئے تھا۔شرم نہ آئی دوسرا نکاح کرتے ہوئے ۔ان بے حیاؤں کو تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے ۔مزے سے بچے پالتی کھاتی ساس سسر کی خدمت کرتی سلمٰی کے کان پر جب یہ باتیں پڑتیں تو وہ بہت افسردہ ہوجاتی اور دل ہی دل میں کہتی کہ میں کسی کو کیا بتاؤں کس طرح بتاؤں یہ تو میں اور میرا خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے دوسرا نکاح کیوں کیا۔اگر کسی شریف شخص نے شرافت سے میرے پاس رشتہ بھیجا اور میں نے مصلحتاً ضرورت سمجھ کر اسے منظور کرلیا تو لوگ کیوں برا کہتے ہیں ۔جبکہ میں نے جائز طریقہ

سے نکاح ہی تو کیا ہے جو ہمارے اسلام میں جائز ہے اور بہتر بتایا گیا ہے یہ دنیا کو کیا ہو گیا ہے یہ مجھ سے کیوں روٹھی روٹھی ہے؟

سلمٰی کی نئی دنیا میں یہ سوال کانٹے کی طرح کھٹکتا کیا میں نے نکاح کر کے جرم کیا ہے ۔میں نے سماج پر کوئی دھبّہ لگایا ہے نہیں میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔لیکن زمانہ کی بے رخی دیکھ کر وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی اور بار بار خزاں رسیدہ پتے کی مانند زرد ہو کر ویرانوں و بیابانوں کی طرف اس کی نگاہیں جاتیں ۔جہاں سوکھے درخت کانٹے دار جھاڑیاں گرم ہوا کے تھپیڑے اس کے نرم عارضوں کو جھلس دیتے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ ''کیا نکاح کر کے میں نے غلطی کی''؟

☆☆

انتظار

مہاراشٹر سے ہنگنا نامی ایک گاؤں میں ایک لڑکی اپنی نانی کے ساتھ چھوٹی سی کھولی میں رہتی تھی ، یہ لڑکی چنک مٹک تیز طرّ ار تھی۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھنگروالے بال گندمی رنگ گول چہرہ درمیانہ قد کھنک دار آواز ہونٹوں سے ٹپکتی ہوئی مٹھاس، جب بات کرتی تو کرتی ہی جاتی سننے والے کا خیال بھی نہ کرتی ۔اس کا نام سائرہ تھا۔

سائرہ کے ماں باپ ناگپور میں رہتے تھے وہ اپنی نانی کے ساتھ رہتی اور کھیتوں میں کام کرتی نانی الگ اپنے کام کے لئے جاتی تھی اس طرح روزی روٹی چلتی پھر اس کی نانی پاس والے گھروں کے کاموں کے لئے ملازم ہوگئی ۔سائرہ کھیتوں میں کام کرنے میں خوش تھی۔

ہرے بھرے کھیت خوبصورت موسم تازہ ہوا پھر کھیتوں کے جوان مالک دلچسپی کا ہر سامان آسانی سے مہیا کیوں نہ ہو؟ سائرہ کی مسکراہٹ اور ادائیں کام کرتے کرتے سائرہ کی دوستی کھیتوں کی مالک سے ہوجانا عام بات تھی پھر جوانی میں جو غلطی ہونے کا ڈر ہوتا ہے وہی غلطی اس سے سرزد ہوگئی ۔مرد کا اس غلطی میں کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن لڑکی کی زندگی بدنام و ویران ہوجاتی ہے حالانکہ مرد بھی اس گناہ میں برابر کا حصہ دار ہوتا ہے۔لیکن مرد کپڑے جھٹک کر الگ ہوجاتا ہے۔عورت اپنے

جسم سے اس گناہ کو دھونہیں سکتی اس لئے صنف نازک کو ہر ہر وقت پاک دامنی کی
لاج رکھنی پڑتی ہے پوری پوری اپنی حفاظت کر کے ہر وقت احتیاط سے پھونک
پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔لیکن جوانی کی عمر میں بہک جانا اور مرد کی جھوٹی باتوں
میں آجانا کوئی عجیب بات نہیں بہر حال ایسا ہی ہوا کھیت کے مالک نے سبز باغ
دکھائے اپنا بنانے کی آرزو ظاہر کی اور سائرہ اس کی آغوش میں گرفتار ہوگئی کچھ دن
تک یہ سلسلہ چلا آخر میں جلد ہی ڈاکٹر نے یہ رپورٹ دیدی کہ وہ ماں بننے والی
ہے۔!!!

دل میں راز لئے رہی چھوٹے سے قد کی نانی جو خود محنت کر کے گھر کا گذارا
کرتی تھی غریب پریشان ہوگئی۔تو اسی پر ملامت ڈانٹ پھٹکار سب ہی کچھ کیا اس
سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟ سب کو معلوم ہونے لگا وقت گذرتا گیا۔آخر وہ وقت
آگیا۔سرکاری اسپتال میں بچہ پیدا ہوگیا تین دن بعد وہ گھر آگئی گاؤں میں یہ بات
پھیلنے لگی کہ بن بیاہی لڑکی ماں بن گئی عورتوں میں طرح طرح کے چرچے ہونے لگے
آخر سوا مہینے بعد وہ ماں اپنے بچے کو لیکر وہ جاگیردار کھیتوں کے مالک کے گھر گئی یہ
سوچتے ہوئے کہ کسی بھی طرح وہ اس کو اپنا لیگا۔

گھر پہنچ کر لڑکے کے باپ کا سامنا کیا اور بچے کو دکھاتی ہوئی بولی یہ آپ
کے خاندان کا بچہ ہے آپ کے بیٹے کی اولاد ہے آپ اس کو اپنا لیجئے یہ سن کر باپ
غصے سے لال پیلے ہوگئے ایک زوردار ڈانٹ دی نکل جا یہاں سے فوراً واپس ہو جا
بے شرم بے حیا بے غیرت تیری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر آنے کی۔کھیتوں میں کام
کرنے والی مزدور عورت جا میرے گھر سے فوراً باہر ہو جا۔

سائرہ نے منت وسماجت کی کہ آپ کا بیٹا مجھ کو چاہتا تھا اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا یہ ہماری نشانی ہے یہ گھر کا وارث ہے میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کے لئے مجھ کو اور اس بچے کو اپنا لیجئے۔باپ نے طنزیہ ایک زوردار قہقہ لگایا تجھے اپنا لیں ؟ کھیت میں مزدوری کرنے والی عورت کو؟ گھر کے نوکروں کو آواز دیکر اس کو دھکے دیکر باہر کرنے کا حکم دیا اسی وقت اس کا بیٹا رئیس آگیا جس کا یہ بچہ تھا جس کے فریب میں وہ گرفتار ہوئی تھی اس نے ایک نظر سائرہ پر ڈالتے ہوئے منہ پھیرلیا۔باپ کے سامنے کچھ نہ بول سکا۔سائرہ کہتی رہی اۓ تمکو خدا کا واسطہ جو تم نے مجھ سے کئے تھے ان وعدوں کا واسطہ لیکن تمام آوازوں و جملوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا وہ منہ موڑتا ہوا آگے چل دیا کچھ بولنے کی مجال نہ ہوئی۔

سائرہ اپنی بے بسی کو لیکر گھر واپس آگئی لیکن انتقام کی آگ سینے میں بھڑک اٹھی وہ کیا کرتی اب کون اس کا ساتھ دے گا؟ سرکار نے اس کے لئے کوئی قانون بھی تو نہیں بنایا! وہ سوچتی رہی میں کیا کروں ؟۔ہزاروں سوال ہر روز اس کے ذہن میں آتے جاتے رہتے ؟

وہ اپنے نانی کی کھولی کے دروازے پر بیٹھی اس بچے کے باپ کا انتظار کرتی رہتی وہ آئے گاوہ آئے گا مگر دور دور تک اس کا پتہ نہ تھا۔

☆☆
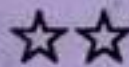
تصویریں

جب رضیہ نے البم میں لگی ہوئی کسی اجنبی لڑکی کی تصویر دیکھی تو اس نے شوہر ارشد سے پوچھا کہ یہ تصویر کِس کی ہے؟ ارشد اس سوال پر گھبرا سا گیا رضیہ نے ارشد کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تب ارشد نے ذرا سہم کر جواب دیا رضیہ یہ میری پھوپھی زاد بہن کی تصویر ہے۔

پھر اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے رضیہ نے کہا۔ ارشد کے دل میں یہ بات چھپی نہ رہ سکی اس نے کہا رضیہ یہ میری منگیتر تھی اور اب یہ مرحومہ ہے۔ رضیہ نے کہا مرحومہ کی تصویر کیوں رکھے ہیں اِسے پھاڑ کیوں نہیں دیتے۔ ارشد نے کہا رضیہ ایسا نہ کہو۔ اس تصویر کے سہارے تو میں نے کئی سال گذارے ہیں اس کو پیار کرتے ہوئے آنسو بہائے ہیں آخر تم سے شادی کر کے مجھے ایک نئی زندگی ملی ہے تم نے میرے زخم کو بھر دیا ہے تم نے اپنی محبت سے اس کی جدائی کے احساس کو مجھ سے دور کر دیا ہے ورنہ اس تصویر کو ہی دل سے لگائے رہتا۔ اور میری زندگی ویران و اداس رہتی ان باتوں سے رضیہ کے دل پر اک بجلی سی گری لیکن برداشت کرتے ہوئے بولی آپ کے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی اس پر مجھ کو بہت افسوس ہے مجھے آپ سے ہمدردی ہے مگر آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ میری محبوبہ کی تصویر ہے۔ ارشد نے کہا ہاں رضیہ یوں ہی سمجھو اگر وہ زندہ ہوتی تو میری شادی اسی کے ساتھ ہوتی وہ بڑی بھولی بھالی

اور بہت خوبصورت تھی اکثر میرے کمرے کو جب ٹھیک کرنے آتی تو میں اس کو اپنی جانب کھینچ لیا کرتا تھا۔کئی کئی لمحات چھپ چھپ کر سرگوشیاں ہوا کرتی تھیں ۔آخر وہ گھبرا کر اپنے چاندی جیسے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگ جایا کرتی اور مجھ پر کافی دیر تک ایک سرور کی سی کیفیت چھائی رہتی وغیرہ وغیرہ۔

ارشد آگے بولتا رہا رضیہ تم نہیں سمجھ سکتیں اس کے انتقال کا مجھ پر کتنا صدمہ گذرا۔سچ مانو میں اس کی یاد میں ہمیشہ اداس رہتا تھا جب تم دلہن بن کر اس گھر میں آئیں تو میں نے اس کو تمہارے اندر پانے کی کوشش کی ۔اور مجھے لگا کہ وہ سچ مچ تمہارے اندر ہے تم اسی کی طرح بن گئیں ۔ارشد اپنی محبوبہ کی یاد میں اتنا کھو گیا کہ اسے یہ احساس نہ رہا کہ رضیہ کے دل پر کیا گذرے گی ۔رضیہ نے کہا کہ شاید تم اسکو مجھ میں نہ پا سکے۔

ارشد نے کہا کہ یہ تو ہے ہر ایک کی بات الگ الگ ہوتی ہے لیکن پھر بھی میں اپنی تضوبیہ کو دل و جان سے پیار کرتا ہوں ۔رضیہ سے اب برداشت نہیں ہو رہا تھا وہ ایک طنزیہ انداز میں مسکرائی اور ارشد کے جذبات میں ڈوبی ہوئی باتوں سے بہت افسردہ ہوگئی ۔رقابت کی آگ سے اس کا دل جھلسا جا رہا تھا رضیہ نے پھر پوچھا ہاں ارشد ڈیر تمہاری پیاری محبوبہ کا نام کیا تھا نام تو تم نے بتایا ہی نہیں ۔ارشد کی آنکھیں کچھ لمحہ کے لئے رضیہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں رضیہ کے دوبارہ پوچھنے پر ارشد نے جواب دیا اس کا نام ہاں یہی نام تھا جو تمہارے نام ہے رضیہ نے حیرت سے پوچھا کیا؟

ارشد نے کہا ہاں رضیہ سچ مانو یہی نام تھا رضیہ وہ میرے خیال و خواب میں چھائی رہتی تھی ۔رضیہ ارشد کی محبوبہ کا اندازہ کر چکی تھی لیکن سوائے افسوس کیا تھا نہ

چارہ گری ہو سکتی تھی نہ دل آزاری۔ وہ اگر زندہ ہوتی تو شاید رضیہ اس کا راستہ صاف کرنے کی کوشش کرتی لیکن اب کرنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

دن گذرتے گئے ارشد رضیہ سے بہت پیار کرتا ہر طرح اس کی دل جوئی کرتا اور خیال رکھتا لیکن رضیہ کے دل میں اس کے شوہر اور اس کے محبوبہ کی عشق کی وارداتیں ذہن میں آ کر کانٹوں کی طرح چبھنے لگتیں۔ لیکن پھر وہ اس کا اظہار نہ کرتی کیونکہ اس سے کوئی فائدہ تو نہ تھا۔

آخر دن پھر خوشگوار گذرنے لگے دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے رہے ایک دن رضیہ اپنے شوہر کے پرس میں لگی ہوئی اپنی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی جس میں وہ دلہن بنی ہوئی اپنے رشتے داروں کے بیچ کھڑی ہوئی تھی۔ ارشد نے یہ تصویر اپنی شادی سے پہلے جب اس کی بات چیت پکی ہوئی تھی تب ہی سے اپنے پرس میں لگا رکھی تھی۔

رضیہ اپنی اس تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی اس وقت ارشد نے کہا رضیہ اپنی شادی سے پہلے ہی یہی تصویر میرا سب کچھ تھی۔ میں جہاں جاتا تھا یہ پرس میری جیب میں رہتا تھا۔ میں اینڈ ہوں؟ یا تفریح گاہ جب بھی کہیں خالی بیٹھتا تمہاری یاد دل میں میٹھا میٹھا سا درد پیدا کرتی اور تم کو دیکھنے کے لئے دل بے چین ہو جاتا تھا پھر میں اپنے اس پرس کو جیب سے نکال کر اس میں لگی ہوئی تمہاری تصویر دیکھا کرتا رات کی تنہائیوں میں اکثر تمہاری یاد سے بے چین ہو کر تمہاری اس تصویر کو اپنی تکیہ پر رکھ لیتا اور آخر میں تمہارے خیال میں ڈوبا ہوا خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا اور وہ پرس صبح تک یوں ہی رکھا رہتا۔

رضیہ تمہاری یاد بہت تڑپاتی تھی بڑی مشکل سے دن گذرے تب جا کر اپنی شادی ہوئی اب میں اپنی چاند سی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہوں ۔رضیہ نے کہا ہاں ارشد مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے ساری خوشیاں ہماری ہیں تمکو پا کر میری ساری آرزوئیں پوری ہوگئیں ۔اپنی زندگی بہت حسین ہے ڈر لگتا ہے کہیں اپنی خوشیوں پر کوئی بجلی نہ گر پڑے۔

جب رضیہ نے پرس میں لگی ہوئی اپنی تصویر کو درست کرنے کے لئے کچھ نیچے کی طرف کھینچا تو اس کے نیچے لگی ہوئی ایک اور تصویر کا سرا اوپر سے دکھائی دینے لگا۔رضیہ نے حیرت واستعجاب سے پوچھا ارشد یہ ایک اور کس کی تصویر ہے؟

ارشد کی رگوں میں جیسے خون باقی نہ تھا اس کا چہرا زرد ہوگیا تھا ہاتھ پیر سرد پڑگئے زبان جنبش نہ کرسکی وہ نظر جھکائے ساکت بیٹھا رہا رضیہ کے دو تین بار پوچھنے پر بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ رضیہ نے اپنی تصویر پرس سے نکال کر نیچے پھینک دی اب دوسری تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی اس کے نیچے اس لڑکی کا نام لکھا تھا رخسانہ۔رضیہ اب غصہ سے آگ بگولہ ہوگئی تھی اس تصویر کو آگے پیچھے سرکایا تو دیکھا ایک اور تصویر جھانک رہی ہے رضیہ نے پھر یہ تصویر پرس سے کھینچ لی اب تو رضیہ غم و غصہ سے بے قابو ہوچکی تھی ۔تیسری تصویر وہی مرحومہ محبوبہ کی تھی ۔ تصویر کے نیچے ارشد کے قلم سے لکھا ہوا تھا ''رضو''

اب رضیہ چیخ چیخ کر روتے ہوئے ارشد پر الفاظ کی بارش کررہی تھی ابھی تک ان تصویروں کو دل سے لگائے بیٹھے ہو۔جب تمہارے پرس سے یہ تصویریں نہ نکلی تو دل سے کیسے نکلے گی جب ان کی یادوں کو نہیں بھلا سکتے تو میرے ساتھ شادی کیوں کی؟ میرے احساسات کو تم نے کچل کر رکھ دیا تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ آخر میں ایک عورت ہوں جو اپنے سوا اپنے شوہر کے پاس کسی کی پرچھائیں بھی برداشت

نہیں کر سکتی۔

دنیا کا ہر دکھ اٹھا کر عورت اپنے آدمی کے ساتھ خوشی سے زندگی گذار دیتی ہے لیکن شوہر کے دل میں جب کسی دوسری لڑکی کا خیال بھی آئے تو اس کے لئے وہ سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔اب میں تم سے کس طرح تم پر اور تمہاری محبت پر اعتماد کروں اپنے شکستہ دل کو کیسے جوڑوں؟ کسِ دل سے تم کو اپنا سمجھوں ارشد کو اپنی غلطی کا احساس ستا رہا تھا۔لیکن پھر بھی وہ کسی بھی تصویر کو رد نہ کر سکا۔کیوں کہ یہ تصویریں اس کے دل و دماغ میں روح بن کر رہ چکی تھیں۔

رضیہ پھوٹ کر رونے لگی اس کی آواز میں ایک جاں سوزی بیچارگی و معصومیت تھی جس کے غمگین تاروں نے ارشد کے دل کو چھولیا اور جیسے وہ جاگ اٹھا اسے احساس ہوا کہ میں بے مروت ہوں بے حس ہوں میں کتنا خودغرض ہوں اپنے دل کو ہلکا کرنے کے لئے میں نے سب کچھ رضیہ کو بتا کر اس کے پاکیزہ دل پر بجلیاں گرادیں۔اس طرح میری محبت میں کمی اور دوسری عورتوں کا عکس نظر آنے لگا۔کاش میں ایسا نہ کرتا! کاش یہ تصویر میرے پاس نہ ہوتی۔میں کبھی ان کا ذکر اپنی زبان پر نہ لاتا۔ان یادوں کو بھلا دیتا ان محبوباؤں کو بھلا دیتا جو وقت کے ہاتھوں میرا ساتھ نہ دے سکیں۔

میں اپنی معصوم رضیہ کے پیار میں ڈوبا رہتا میرے اور رضیہ کے درمیان نہ آتیں یہ ''تصویریں''

وہ رضیہ کی جانب آگے بڑھتے ہوئے گویا ہوا رضیہ تم مجھے معاف کردو اب تم ہی میرے دل کی دھڑکن ہو تم ہی میری زندگی تم ہی میری ملکہ لیکن اب رضیہ کو ارشد کی یہ باتیں پہلے کی طرح متاثر نہ کرسکیں اس کے ذہن پر چھا گئیں ''وہ تصویریں''۔

☆☆

پورے ہوئے خواب

شہر کا ٹاؤن ہال اور اس کا میدان دور دور تک روشنی سے جگمگا رہا تھا اسکو بیحد محنت سے سجایا گیا تھا۔ مین روڈ پر اس کا داخلی دروازہ تھا۔ جہاں سے ایک گیلری مہمانوں کے آنے جانے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس پر کارپیٹ بچھا ہوا تھا جس کے آس پاس دونوں طرف روشنی کی جھالریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ گیلری آگے جا کر دو راستوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک سمت ویج کا اور دوسری سمت نان ویج کا بورڈ آویزاں تھا۔ پارکنگ کے لئے کافی حصہ چھوڑا گیا تھا جس کا راستہ الگ تھا۔ جہاں بے شمار دو پہیہ اور چار پہیہ والی گاڑیاں کھڑی تھیں جو دور دور سے مہمانوں کو لیکر آئی تھیں۔

دولہا دلہن کے لئے پھولوں اور روشنی سے نہایا ہوا شاندار اسٹیج بنایا گیا تھا جس میں دو اعلیٰ درجے کی کرسیاں رکھی تھیں جہاں فوٹوگرافروں کے ذریعے ویڈیو فلم بنائی جا رہی تھی۔ مہمان اسٹیج پر آکر مبارک باد اور سلامی یعنی نذرانے اور تحائف دے رہے تھے۔

مشروبات اور آئس کریم وغیرہ سے سبھی مہمان محظوظ ہو رہے تھے۔ ہلکی پھلکی موسیقی کی آوازیں فضا میں سرور کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں رنگ اور نور کے خوشگوار ماحول میں ٹھنڈی ہوائیں نہروں کی طرح بہہ رہی تھیں چلتے چلتے راہ گیر ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کر رہے تھے کہ آخر یہاں کس کی تقریب ہے۔

دراصل آج شہر کے ایک ایسے گھرانے کی بیٹی کی شادی تھی جسکی امی فرزانہ اپنی بیٹی کی شادی راجدھانی کے کسی لڑکے سے کرنے کی برسوں سے آرزومند تھیں۔یوں تو بیٹی کے کئی پیغام آئے لیکن فرزانہ نے طے کرلیا تھا کہ وہ اس کی شادی کسی تعلیم یافتہ لڑکے سے راجدھانی میں ہی کرینگی۔

کیونکہ اس کی خود کی شادی وہاں نہیں ہو پائی تھی جس کی کسک آج بھی اسے محسوس ہوا کرتی تھی۔لیکن یہ کمی وہ اپنی بیٹی کے لئے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ان کی دل کی بات خدا نے سن لی اور ایک اچھے خاندانی اور شریف لڑکے کا رشتہ بھیج دیا۔

فرزانہ ایک متوسط مسلم گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔جو ایک قصبہ تھا اور راجدھانی سے (45) کلو میٹر دور تھا۔وہاں اس کی ننیھال تھی والد اگرچہ راجدھانی کے رہنے والے تھے لیکن وہ بھی بسلسلۂ ملازمت وہیں جا کر رہنے لگے تھے۔لیکن کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ شہر آگئے تھے۔فرزانہ بچپن سے ہی پڑھائی کی شوقین تھی۔اس نے قصبے میں مڈل اسکول تک فرسٹ ڈویژن امتحانات پاس کئے تھے اس کے بعد اس نے اپنے والد فیضان کلیم سے راجدھانی میں رہ کر آگے کی تعلیم حاصل کرنے کی ضد کی تھی۔والد اس سے بیحد محبت کرتے تھے اور اس کی کسی بات کو ٹالا نہیں کرتے تھے انہوں نے اسے اپنے پاس بلالیا۔گھر میں انکی چچی، بھائی اور چچازاد بہنیں ساتھ ایک گھر میں رہتے تھے۔وہ بھی اسکول اور کالج جایا کرتی تھیں۔فرزانہ کو ان کا ساتھ بڑا اچھا لگا۔وہ اپنی پھوپیوں کے ساتھ ہائی اسکول بس میں جایا کرتی تھی۔وہ دل لگا کر اسکول کا کورس پڑھتی گھر کے لوگوں سے پیار ومحبت کے ساتھ رہتی رہی۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ نواں اور دسواں کلاس فرسٹ [illegible]

گئی۔اس زمانے میں ہائر سکنڈری کلاس نہیں کھلا تھا۔

اب سوال تھا کالج کی پڑھائی کا چنانچہ فرزانہ نے گرلز کالج میں اپنا فارم بھر دیا اس کو یہاں بھی ایک خوشگوار ماحول ملا۔پڑھائی کے ساتھ دوسری لڑکیوں سے دوستی ہنسی مذاق، کھیل کود، جلسے اور مشاعرے وغیرہ کالج کی زندگی کا ایک حصہ تھے فرزانہ نے ان سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کی۔

پڑھائی میں چونکہ اس کا رکارڈ بہت اچھا تھا اس لئے اس کو میرٹ اسکالرشپ بھی ملنے لگا۔شہر میں آئے دن رشتے داروں میں تقریبات اور شادیاں ہوتی رہتی تھیں وہ اپنی پھوپیوں کے ساتھ انمیں بھی شامل ہوتی رہی۔

فرزانہ چاہتی تھی کہ کاش اس کی شادی راجدھانی میں ہوجائے اور وہ مستقل طور پر قصباتی زندگی کے بجائے راجدھانی میں رہنے لگے۔اس کے دل و دماغ میں آرزوئیں جنم لیتیں کاش میری قسمت کا ستارہ بھی کسی آنگن میں جگمگائے جہاں کی پاکیزہ فضا نے اس کو تعلیم یافتہ اور قابل بننے کے حوصلے عطا کئے۔اس نے شہر میں رہنے سہنے اور بولنے کے سبھی طور طریقے سیکھ لئے تھے۔لیکن نہ جانے کیوں شہر میں بے شمار اعزا ہوتے ہوئے بھی کسی نے اس کا ہاتھ نہیں مانگا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس نے بی۔اے کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔اب اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ واپس اپنی ننھیال چلی جائے۔کچھ دن بعد ہی اس کے ضلع میں ٹیچرس کی آسامیوں کا اشتہار نکلا۔فرزانہ نے بھی اپنی درخواست بھیجدی۔انٹرویو ہوا اور اسے بغیر کسی سفارش کے منتخب کرلیا گیا

اب یہاں سے فرزانہ کی زندگی میں عمل، جد وجہد اور تکالیف جھیلنے کا آغاز ہوا۔ یہ ملازمت ضلع کی آخری تحصیل کے ایسے گاؤں میں ملی تھی جہاں پکی سڑک نہیں تھی۔ بارش کا زمانہ۔ اسے انہیں حالات میں سروس جوائن کرنا تھا۔ اس زمانے میں فرزانہ کے والد بمبئی گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی امّی کو ساتھ لیکر روانہ ہوگئی۔

دشواریوں سے کھیلنا فرزانہ کی عادت بن چکی تھی۔ ساون کا مہینہ، بھرپور بارش، کچے راستے، اجنبی مقام اور لوگ، لیکن وہ ان تمام دقتوں کا سامنا کرتے ہوئے بالآخر اس گاؤں پہنچ گئی اور اپنی سروس کو جوائن کرلیا۔ گاؤں کے سارے ہی لوگ غیر قوم کے تھے لیکن انہوں نے اس کی مدد کی۔ اسے رہنے کو ایک مکان مل گیا۔ جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ آرام سے رہنے لگی۔ وہ روزانہ گھر سے اسکول کیچڑ بھری آڑی، ترچھی پگڈنڈیوں سے گذرتی ہوئی اسکول جاتی آتی رہی۔ یہ ایک مڈل اسکول تھا جس کے ہیڈ ماسٹر بھی بہت بھلے انسان تھے۔ انہوں نے فرزانہ کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ فرزانہ نے پورا ایک سال اسی گاؤں میں رہ کر کاٹ دیا، مارچ اپریل میں امتحان ہوئے اور پھر گرمیوں کی لمبی چھٹی ہوگئی۔ وہ اپنی ننھیال واپس ہوگئی۔

اسی زمانے میں فرزانہ کا ایک رشتہ اسکی ننھیال کے ایک لڑکے کا آچکا تھا، جو ایک دوسرے ضلع کا رہنے والا تھا۔ کہا گیا تھا کہ وہ بی۔ اے پاس ہے فرزانہ کے والدین نانا، نانی وغیرہ نے اسے قبول کرلیا۔ اور گرمی کی چھٹیوں میں ہی اس کی شادی بھی ہوگئی فرزانہ نے اپنے بڑوں کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا جو ایک مشرقی خاتون کا فرض ہوتا ہے حمید میاں اس کے شوہر بن گئے اور وہ دوسرے ضلع میں اپنی سسرال پہنچ گئی۔

فرزانہ کی سسرال حالانکہ ضلع کے صدر مقام پر تھی لیکن گھر کا ماحول خالص دیہاتی تھا۔ فرزانہ کے سسر ایک کاشتکار تھے۔ ان سے شادی کرتے وقت یہ کہ دیا گیا تھا کہ لڑکی سروس کرتی ہے لیکن انہوں نے اس وقت کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فرزانہ کے والد فیضان کلیم اس وقت راجدھانی کے ایک ڈیلی اخبار میں پتر کار ہو گئے تھے انہوں نے وزیروں سے مل کر اس کا تبادلہ اس ضلع میں کرادیا جہاں اس کی سسرال تھی ۔یہاں بھی اسے گاؤں میں سروس کرنا پڑی جو بہرحال روڈ پر تھا۔ وہ اپنا سارا جہیز سسرال میں چھوڑ کر گاؤں میں ایک کمرہ کرایہ پر لیکر رہنے لگی۔ سسرال والوں کو اس کا سروس کرنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے فرزانہ کو سروس چھوڑنے کے لئے مجبور کیا۔ لیکن وہ سسرال کے ماحول سے مطمئن نہیں تھی۔ اس کی چار نندیں تھیں جو اپنے ماں باپ کی حمایت کرتی تھیں اور اس سے جھگڑا بھی کیا کرتی تھیں، سسرال والوں نے جب اس پر زیادہ زور ڈالا تو وہ لمبی چھٹی لے کر اپنے مائیکہ آگئی۔

ایک دن اس کے والد فیضان کلیم اس سے ملنے آئے تو دونوں میں گفتگو ہوئی۔

والد : کیوں بیٹی کیا حال چال ہے؟

فرزانہ : ابا جی حال چال تو ٹھیک نہیں ہیں۔

والد : کیا بات ہے صحیح صحیح بتاؤ۔

فرزانہ : میری سسرال والے مجھے سروس چھوڑنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔

والد : پھر تم کیا چاہتی ہو؟

فرزانہ : میں تو سروس کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے سسرال والوں پر بھروسہ نہیں ہے

کہ وہاں سروس چھوڑ کر میری زندگی سکون سے گذر جائے گی۔

والد : ٹھیک ہے تم سروس مت چھوڑو اور اسکول جوائن کرلو۔

فرزانہ : سسر اور شوہر نے دھمکی دی ہے کہ اگر تم اسکول جاؤ گی تو ہم زبردستی تمہیں وہاں سے لے آئیں گے۔

والد : اچھا بات یہاں تک بڑھ گئی ہے؟

فرزانہ : جی ہاں!

والد : (کچھ سوچنے کے بعد) ٹھیک ہے تم اسکول جاؤ۔ میں دیکھونگا کہ وہ لوگ کس طرح تمہیں زبردستی لاتے ہیں۔

اس طرح فرزانہ والد کی گفتگو سے مطمئن ہوکر اسکول چلی گئی۔ جہاں ایک ہفتے کے اندر ہی اس علاقے کے سب انسپکٹر اس کے پاس آئے اور پوچھا کہ آپ کے والد نے کلکٹر اور ایس۔پی صاحب کو درخواست بھیجی ہے کہ آپ کے سسرال والے آپ کے ساتھ زبردستی کرنا چاہتے ہیں تاکہ آپ سروس چھوڑ دیں۔

فرزانہ کی تعلیم اور ذہانت نے یہاں بڑا کام کیا اس نے جواب دیا کہ جی ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے جس کی بناء پر والد نے درخواست دی ہے لیکن یہ بات پہلے کی ہے آجکل تو ماحول ٹھیک ہے۔اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں آپ کو خبر کر دوں گی۔

یہی پوچھ تاچھ فرزانہ کے سسر اور شوہر سے بھی کی گئی اس کے بعد ان لوگوں نے سروس چھوڑنے کے لئے فرزانہ سے کہنا بند کر دیا۔ایک سال بعد فرزانہ کو بیسک ٹریننگ کے لئے راجدھانی جانے کا حکم ملا۔وہاں اس نے ٹریننگ مکمل کی۔اس

درمیان فرزانہ کے شوہر کی آمد ورفت برابر جاری رہی ۔اب اس کے یہاں دو بچے ہو چکے تھے ان بچوں کی دیکھ بھال ، بیماری ،دوادارو، گھر کا کام اوراسکول جانے آنے کا سارابوجھ اس کے کاندھے پر تھا۔

ٹریننگ کے بعد اس کا تبادلہ پھر ایک نئے ہائی اسکول میں ہوگیا ۔جہاں اس کی ساتھی کئی ٹیچرس ایم،اے پاس تھیں ۔فرزانہ صرف بی ،اے ہونے کی وجہ سے احساسِ کمتری محسوس کرتی تھی چنانچہ اس نے پولیٹیکل سائنس میں ایم،اے کی تیاری شروع کردی ۔دوسال میں اس نے یہ امتحان بھی پاس کرلیا۔اس کے بعد فرزانہ کے والد نے اس کا تبادلہ اس کی سسرال والے شہر میں کرادیا۔ وہاں وہ سسرال میں نہ رہ کر علیحدہ ایک کرایہ کے مکان میں رہنے لگی ۔

ایک دن اس نے اخبار میں پڑھا کہ پبلک سروس کمیشن کی طرف سے لیکچرارس کی آسامیاں خالی ہیں ان کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں ۔فرزانہ نے درخواست دیدی۔ اس کا امتحان ہوا خدا کا کرنا ہوا کہ وہ سلیکٹ کرلی گئی ۔اس طرح اس کی تنخواہ کا اسکیل بڑھ گیا ۔اوروہ ہائی اسکول میں لیکچرار بن گئی ۔ساتھ ہی ایک مشکل یہ آپڑی کہ اس کا تبادلہ پھر ایک گاؤں میں جہاں ہائر سکنڈری اسکول تھا کر دیا گیا ۔جو اس کے شہر سے (65) کلومیٹر دور تھا ۔گاؤں کچھ اچھا نہیں تھا اور وہاں رہنے کومناسب جگہ اور ماحول نہیں تھا ۔چنانچہ فرزانہ اپنے شہر سے روزانہ اپ اینڈ ڈاؤن کرتی رہی ۔وہ صبح 9 بجے گھر سے نکل کر بس پکڑ کر اسکول جاتی اور رات کو تقریباً 8-9 بجے گھر آتی ۔اس کی ماں بچوں کے پاس رہتی تھیں ۔حمید میاں بھی اسی کے ساتھ آکر رہنے لگے تھے ۔فرزانہ کے والد نے بہت کوشش کی کہ اس کا تبادلہ گاؤں

کے بجائے شہر کا ہو جائے لیکن اس درمیان دوسری پارٹی کی سرکار بن چکی تھی اس لئے وہ تبادلہ نہیں کرا سکے ۳ سال کے بعد سرکار بدلی تب اس کا ٹرانسفر اس کے شہر میں ہو گیا۔اب فرزانہ کو سکون میسر ہوا۔اس نے اور شوہر حمید میاں نے مل کر شہر میں ایک پختہ دو منزلہ مکان خرید لیا۔

فرزانہ اور اس کے بچوں نے مل کر مکان کو سجایا،سنوارا،اس میں موجودہ زمانے کی تمام سہولتیں مہیا کیں ۔صوفہ سیٹ،کولر،فریج،پنکھے،واشنگ مشین شاور،باتھ روم وغیرہ وغیرہ۔اب فرزانہ کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں بڑی ہو گئی تھیں۔یہ سب کالج کی پڑھائی کر رہے تھے،حمید میاں کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔انہیں ۱۲۵ ایکڑ زمین سنچائی والی ملی وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہتے تھے گھر میں تین دو پہیہ والی گاڑیاں اور ایک کار آ چکی تھی۔

شہر میں اور خاندان میں فرزانہ کی بہت عزت تھی ۔اسکول میں سب اسے میڈم کہہ کر پکارا کرتے تھے ۔لڑکیاں جوان ہو چکی تھیں لڑکوں سے پہلے وہ ان کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی تھی آخر کار اس کی دعاؤں کو قبولیت کا شرف حاصل ہوا اور اس کی بڑی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے انجام کو پہونچی ۔جب بیٹی کی رخصتی ہو رہی تھی تو اس کے والد فیضان کلیم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ ''بیٹی آج تمہارے خواب پورے ہو گئے''

☆☆

جو وہ چاہیں گے

قیصر اپنے بھائی کی منگنی پر بہت خوش تھا۔ کیونکہ اس کے بھائی کا رشتہ اچھے خاندان میں بہت پیاری و خوبصورت لڑکی سے ہوا تھا۔ اس خاندان میں حسین حسین لڑکیاں تھیں۔ حسن اور تعلیم سے آراستہ خوش مزاج و چنچل لڑکیاں جو خاندان کے لئے رونق و عزت کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

ایک دن وہ بھی آیا جبکہ قیصر کے بھائی کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگئی ۔قیصر انجینئرنگ پڑھ رہا تھا اس کی یہ آخری سال تھی ۔قیصر کے بھائی کی شادی کے بعد اس کی شادی کا نمبر تھا۔ تین بہنوں کی بھی شادی ہو چکی تھی ۔قیصر کا خاندان معزز ترین خاندانوں میں سے ایک تھا اس کے والدین نے کافی عرصہ تک عرب میں رہ کر بہت دولت کمائی پھر اپنے وطن میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی تھی ۔قیصر کے والد بہت رعب ودبدبے والے انسان تھے اس لئے بیٹوں کی کسی بھی بات پر مخالفت کرنے کی ہمت نہ تھی وہ لوگ ان کی نظریں دیکھتے تھے پھر ان کی ساری جائداد کے مالک آخر میں دو بیٹے ہی تھے۔

قیصر یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے گھر میں سب کی شادیاں اس کے والدین کی مرضی سے ہوئی ہیں اس کی شادی بھی انہیں کی مرضی سے ہوگی اس لئے وہ کسی بھی لڑکی پر نظر نہ ڈالتا اس کے چچا کی ایک لڑکی تھی B.A کی دوسری سال میں

پڑھ رہی تھی جو بہت خوبصورت تھی ۔لیکن قیصر نے اس کے بارے میں کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ اس کی دلہن بنے گی ۔ یہ اندازہ نہ تھا کہ میرا رشتہ چچا کی لڑکی سے طے ہوگا جب بڑے بھائی فرحت کی شادی ہوئی اس وقت قیصر بہت خوش تھا وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک حسین لڑکی کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکا اسے حاصل کرنے کے لئے قیصر کا دل بے چین ہوگیا وہ ہرصورت میں اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ۔کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بھابی کے خاندان سے اس کے والدین بہت متاثر تھے یہ ایک نام ور وعزت دار خاندان تھا پھرلڑکی اس کی بھابی کی پھوپی زاد بہن تھی ۔کانوینٹ اسکول کی پڑھی ہوئی اندورشہر کے پرائیویٹ کالج میں .B.S.C کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

اس لڑکی کا حسن ہرایک کے دامنِ دل کو کھینچتا تھا۔سلونا چہرہ دودھیا چہروں کو مات کرتا ۔آنکھیں وہ غضب ڈھاتیں کہ سیدھی بجلیاں دل پہ گرتیں ۔نظر کے تیر اُمنگیں پیدا کردیتے ۔اس کی مسکراہٹ پر بند کلیاں چٹکنے لگتیں کوئی جوان لڑکا ایسا نہ تھا جو اس کے حسن کی جادوگری سے متاثر نہ ہو ۔ وہ شوخ چنچل حسینہ بے نیاز رہتے ہوئے بھی سب کے دل پر بجلیاں گرادیتی ۔

اُسے کسی سے عشق کا شوق نہ تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میری شادی میرے ماں باپ کے مرضی سے ہوگی ۔نہ ہی اسے اپنے حسن کا احساس تھا وہ بے پرواہ حسن اور بھی دلکش معلوم ہوتا ۔قیصر اپنے دل میں اس کے سپنے سجاتے ۔طرح طرح کے خواب بنا کرتا تصورات میں گم ہوجاتا اُسے ہرطرف فرح کا ہی چہرہ نظر آتا ۔شادی کی دھوم دھام میں دلہا دلہن والوں میں لڑکا لڑکیوں میں خوب چھیڑ چھاڑ چلتی ۔

شرارتیں ہوتیں ۔شوخی و مستی و رنگ بھرے گیت گائے گئے تالیاں بجا بجا کر ایک دوسرے نے سوال و جواب گیتوں میں گائے ماڈرن بنا بنّی گائے گئے ۔دونوں طرف والوں میں مختلف دلچسپ رسومات ہوئیں بہترین مووی بنی بیشمار تصویریں کھینچی گئیں۔

ان تمام موقعوں پر قیصر کی چھیڑ چھاڑ اس کی بھابی کی پھوپی زاد بہن فرح سے ہوتی رہی ۔فرح یہ نہ جانتی تھی کہ یہ چھیڑ چھاڑ ایک دن ایک حقیقی افسانہ کا روپ لے لیگی۔

شادی ہوچکی اب قیصر اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے اپنے بھائی کی شادی کی مووی دیکھتا گھنٹوں دیکھتا ہی رہتا فرح کا چہرہ ہر جگہ نمایاں تھا۔دلہن کی سال سنبھال خاص اسی کے ہی ذمہ تھی کیونکہ وہ بہن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی خاص سہیلی بھی تھی۔

قیصر اکثر نئی بھابی کو میکے چھوڑنے آتا اسی دلچسپی سے کہ وہاں فرح سے ملاقات ہوجائے گی ۔دلہن کی بہنوں نے فرح کو اپنے گھر مہمان روک رکھا تھا۔آخر سارے ہنگامے ختم ہوئے سب اپنے اپنے گھروں پر اپنے کالج و اسکول میں مصروف ہوگئے اور شادی کی یادیں دل میں بیٹھا میٹھا احساس بن کر اُٹھتیں رہیں ختم ہوتی رہیں۔

قیصر کے والدین بہت ہوشیار تھے انہوں نے قیصر کو زیادہ گھلتے ملتے دیکھا تو سب کے سامنے بڑی سادگی سے باتوں ہی باتوں میں اس بات کا اعلان کردیا کہ میں قیصر کا بھی رشتہ طے کرچکا ہوں اس کی چچازاد بہن سے ہم لوگوں میں بات ہوچکی ہے لیکن قیصر کو ابھی پتہ نہیں چلا ہے ۔جس جس کو معلوم ہوتا کسی کے پیٹ میں یہ بات نہ ٹھہرتی ۔اور وہ قیصر کو چھیڑنا شروع کردیتا۔''چھپے رستم نکلے'' یہی نہیں معلوم

تھا کہ تمہارے اندر اتنے گن ہیں وغیرہ قیصر حیران تھا کہ وہ کون ہے جس سے ابا میرا رشتہ طے کر چکے ہیں۔

آخر ایک دن اس کی بھابی نے چھیڑا واہ میاں قیصر ہمکو پہلے ہی کیوں نہ بتادیا کہ ہم چچا کی لڑکی فرزانہ سے شادی کرینگے یہ سن کر قیصر حیران رہ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے سارے خواب بکھر گئے چکنا چور ہو گئے۔

جو سپنے اس نے فرح کے ساتھ دیکھے تھے ان کے سب رنگ اُڑ گئے خواب ٹوٹ گیا جیسے وہ نیند سے جاگ اُٹھا۔ اس کے دل پر بجلیاں گر گئیں گویا سب کچھ خاک میں مل گیا اگر چہ چچا کی بیٹی بھی خوبصورت تھی سگھڑ لڑکی تھی۔ لیکن قیصر تو اپنا دل فرح پر نثار کر چکا تھا اب اس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اگر چہ فرح کو اس بات کا پورا یقین بھی نہ تھا لیکن قیصر اپنے خیالوں میں اسے سنوارا کرتا تھا۔ اب دن رات وہ اپنی شادی کے بارے میں سوچ سوچ کر اداس رہتا اور ان خوبصورت لمحات کو یاد کرتا جو فرح کے ساتھ بھائی کے شادی کے دوران گذارے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے سرگوشیاں کی تھیں۔ بھٹکنے پر اکسایا تھا آج میں کس طرح فرح سے کنارہ کشی کروں، اس کی ممی کو میں نے اپنی ممی کے روپ میں دیکھا تھا میں ان سے کیسے نظریں چراؤں گا۔

قیصر بیحد چنچل شرارتی اور باتونی لڑکا تھا۔ اب اس کو خاموش رہ کر نظریں جھکانا ہوگا۔ یہ غم قیصر اور اس کے دل کو کھا رہا تھا۔ مگر ماں باپ کے رعب و دبدبے کے سامنے وہ اپنی چاہت کا گلا گھوٹنے پر مجبور ہو گیا اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی چاہت کا اظہار کرتا۔ وہ کیا کرے کس طرح اپنے خوشیوں کا گلا گھونٹے کچھ سمجھ میں نہ

آتا تھا۔

ایک دن وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کی بھابی نے آکر اس کی تنہائی کو توڑا۔ قیصرا کیلے بیٹھے کیا کر رہے ہو تمہارا چہرہ اترا۔اترا ہے رنگ اڑا۔اڑا آنکھوں میں حلقے تمہاری وہ شرارتیں شوخی و ہنسی مذاق سب کہاں گم ہو گیا۔ آج کل بہت کھوئے کھوئے رہتے ہو کیا بات ہے؟

قیصر نے بڑی ہمت سے بولنا چاہا لیکن بھابی ۔کہتے ہوئے اس کی آواز بھرّا گئی بہ مشکل وہ پھر سے بولا ۔بھابی میں فرح سے محبت کرتا ہوں میں اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں لیکن ابا امّی میری بات چیت چچا کی لڑکی فرزانہ سے کر چکے ہیں ۔اب میں کیا کروں؟

کاش ابا مجھے پہلے ہی بتا دیتے تو میں اپنا کوئی خواب نہ بنتا ان کے خوابوں میں ہی رنگ بھر لیتا میں کس طرح فرح کے تصور کو دل سے نکالوں جو میرے دل و دماغ میں میری زندگی بن کر چھا گئی ہے وہ میری ہر سانس میں گھر کر چکی ہے۔

یہ سن کر بھابی کی نظر قیصر پر جم کر رہ گئی ۔لیکن وہ خالی خالی آنکھیں جو اس بارے میں اس کی کوئی مدد کر ہی نہیں سکتی تھیں ۔کوئی بھی اس کے والدین کے سامنے قیصر کی سفارش نہیں کر سکتا تھا ۔بھابی ایک بے بسی کے ساتھ ماتھے سے ہاتھ لگا کر کھڑی رہ گئیں ۔اتفاق سے قیصر کی امی آگئیں ۔ بہت پوچھنے پر ڈرتے ڈرتے یہ بتایا گیا ۔اس انہوں نے یہی جواب دیا۔ جو فیصلہ تمہارے ابا کا ہے وہ اٹل ہے ۔تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں انہوں نے رشتہ طے کیا ہے۔ وہی ہوگا جو چاہیں گے۔

☆☆

خوبصورت آنکھیں

شہلا بمبئ کے ٹی وی اسٹیشن سے اِٹارسی جانے کے لئے ٹرین میں بیٹھی تھی
گہری ہری ساڑی ، ہرا بلاؤز پہنے ہوئے کانوں میں سونے کے چھوٹے چھوٹے
ٹاپس گلے میں لاکٹ والی چین میڈیم ہیل کی چپل کالے اور گھنگر والے بال سیدھا
سادھا چہرہ ، رنگ گورا ایک کھویا کھویا سا انداز ۔ آنکوں میں گہرائی کبھی وہ شوخ لگتی کبھی
اتنی خاموش اور سنجیدہ نظر آتی کہ سامنے والے کو ہمدردی پیدا ہونے لگتی ۔

برسات کی ایک خوبصورت ترین شام تھی ۔ سوا چار بجے باہبے کے وی ٹی
اسٹیشن سے ٹرین روانہ ہوئی رِزرویشن کمپارٹمینٹ تھا سبھی مہذب لوگ بیٹھے ہوئے
تھے شہلا کے ساتھ اس کی ماں تھیں اور اس کی دو بیٹیاں ایک آٹھ سال کی تھی دوسری
چھ سال کی ۔ ماں بچیوں کو سنبھالے ہوئے ٹرین میں آڑی سیٹوں پر آرام سے سامان
کے ساتھ بیٹھی تھیں ۔

شہلا نہ جانے کیوں آج اتنی شوخ ہوگئی تھی شاید موسم کا اثر تھا ۔ سامنے کی
ہی سیٹ پر ایک بردبار سانولا سلونا سا شخص بیٹھا ہوا تھا جو صورت و عمر سے شادی شدہ
معلوم ہوتا تھا ۔ بار بار سگریٹ کا دھواں گولے بنا کر ہوا میں چھوڑ رہا تھا ۔ شہلا کو
سگریٹ کا دھواں دیکھنے میں بہت اچھا لگتا تھا ۔ بارش کی نرم ہوائیں یہ گرم دھواں بڑا
دلکش معلوم ہو رہا تھا شہلا کو ہلکی ہلکی زردے کی خوشبو مدہوش کئے دیتی تھی

شہلا نے جب اس نوجوان کی طرف دیکھا تو وہ بھی اس کی خوبصورت آنکھوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔اس کا بار بار سگریٹ کے کش پر کش لینا اور شہلا کی آنکھوں میں ڈوب جانا۔

شہلا نے دیکھا اور دل ہی دل میں بولی ہائے وہ ظالم بھی میری طرف دیکھ رہا ہے وہ مجھے کیوں دیکھ رہا ہے اس لئے کہ میں بھی اُسے دیکھ رہی ہوں۔شہلا کا جی چاہتا تھا کچھ نہ دیکھوں میں اپنی نظریں اس کی آنکھوں پر جمادوں۔شہلا بچپن سی ہی خوبصورت آنکھوں کی تھی اس میں تمام چیزوں سے زیادہ متاثر کرنے والی اگر کوئی چیز تھی تو وہ تھیں ''خوبصورت آنکھیں'' آج یہ خوبصورت آنکھوں والا شخص نہ جانے کیوں اس کے اس سفر کو رنگین بنا رہا تھا اور وہ بھی ان آنکھوں میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔

کوئی جسمانی لگاوٹ تھی نہ کوئی قربت بس وہ تو ٹک ٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔شہلا کے دل میں بار بار یہ خیال چٹکیاں لے رہا تھا کاش میں اپنا جیون ساتھی اپنی مرضی سے چنتی۔میری امی میری شادی کے وقت مجھ سے رائے لیتی میری پسند معلوم کرتیں تو میں اپنی پسند سے خوبصورت آنکھوں والا شوہر چنتی۔چہرے پر آنکھیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔خوبصورت آنکھیں زندگی کو ہر وقت تروتازہ رکھتی ہیں محبت کا جام پلاتی ہیں رومانی دنیا کی سیر کراتی ہیں دل کو سرور و تازگی بخشتی ہیں زندگی کو کیف وسرور کے لمحات عطا کرتی ہیں۔

اس شخص کی آنکھوں میں ایک خمار نشہ اور زندگی کی رنگینیاں اور رعنائیاں منڈلا رہی تھیں۔بڑی گہرائی اور بڑا سرور تھا شہلا کچھ دیر اپنے آپ کو بھول کر ان

آنکھوں میں کھوگئی ۔ بارش ہونے لگی ۔کھڑکی سے پانی آ رہا تھا شہلا کا ہاتھ کھڑکی میں رکھا ہوا پانی میں بھیگ رہا تھا لیکن وہ جنبش کرنے کو بھی تیار نہ تھی یہ گیت اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگا" آج پھر جینے کا ارادہ ہے آج پھر مرنے کی تمنا ہے"۔

ایک ایک لمحہ قیمتی و مسرت آگیں تھا ۔ شہلا سوچ رہی تھی یہ ٹرین یوں ہی چلتی رہے کبھی نہ رکے اور زندگی اسی سفر میں کٹ جائے ۔وہ سلونا شخص ابھی شہلا کی میٹھی و پیاسی آنکھوں میں کھو سا گیا تھا اسے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ بھی چاہتا تھا کہ شہلا کی آنکھوں سے ایک پل بھی نظر نہ اٹھائے ۔لیکن بیچ بیچ میں رکاوٹیں آتی رہیں ۔وہ تو ٹرین تھی پھر لوگوں کی نظروں سے بھی تو بچنا پڑتا ہے۔

ایک خیال اس کے دل میں اچھل رہا تھا کہ میں کیا کروں کس طرح سامنے بیٹھی ہوئی شہلا کی نظروں کی گرفتاری کا اظہار کروں کس طرح زبان کھولوں ۔کوئی موقع نہیں مل رہا تھا ۔کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی ۔بار بار سنبھل سنبھل کر بیٹھتا کبھی کھڑکی سے باہر ہرے بھرے جنگل پہاڑ اور بادل دیکھنے لگتا پھر شہلا پر نظریں ڈالتا ۔ادھر شہلا بھی طرح طرح سے انداز بدل بدل کر بیٹھتی اور خمار آلود نگاہیں اس شخص پر ڈالدیتی ۔بات کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی ۔آخر شام ہوگئی اندھیرا پھیل گیا ہر چیز دھندلی ہوگئی۔

ٹرین میں لائٹ تھی لیکن روشنی بہت کم وہ نوجوان اپنی سیٹ سے اُٹھ کر باتھ روم جانے کے لئے آیا اور شہلا کی سیٹ کے پاس آکر رک گیا اور بولا:

"What I shoud do for you " / "Nothing" شہلا نے جواب میں کہا لیکن وہ شخص اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا کیونکہ وہ ایک شریف آدمی

تھا واپس جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا سارے مسافروں نے اپنا اپنا کھانا کھایا اور اپنے اپنے برتھ پر بستر وغیرہ بچھا کر لیٹ گئے۔

شہلا سونا چاہتی تھی نہ ہی وہ شخص، مگر لائٹ اتنی کم تھی کہ ایک دوسرے کا چہرہ ہی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آخر کیا کرتے اپنی اپنی سیٹوں پر آنکھوں میں میٹھے میٹھے خمار لئے ہوئے لیٹ گئے۔ ادھر شہلا کی ماں نے بچوں کو سلا دیا، شہلا سوچنے لگی کشش کی یہ چنگاری کیوں پیدا ہوئی کسی کی آنکھوں کا خمار ونشہ میں نے اپنے آنکھوں میں کیوں اتار لیا اُسے اپنی آنکھوں کا نشہ کیوں دیدیا۔

اس لئے کہ میری کمزوری ہیں "خوبصورت آنکھیں" صبح کے چھ بج رہے تھے اسٹیشن آنے والا تھا شہلا اترنے کی تیاری کرنے لگی وہ ایک بات کہنے کے لئے بے چین تھی اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نوجوان کا سفر بھی اُسی مقام پر ختم ہوجائے گا شہلا اپنے سامان وغیرہ کے ساتھ ٹرین سے اتری وہ شخص بھی اپنا سوٹ کیس لیکر اُتر گیا۔ اس کی نگاہیں شہلا کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئیں۔

شہلا نے قریب آکر ہونٹوں کو جنبش دی Please آپ سگار نہ پیا کریں۔ تاکہ یہ خوبصورت آنکھیں زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکیں اور کسی کو زندگی دے سکیں وہ مسکرایا اور دونوں دل میں ایک خلش کے ساتھ خوبصورت ملاقات کی رنگینیاں آنکھوں میں لئے ہوئے الگ الگ راستے پر چلے گئے۔

☆☆

یہ نہ تھی ہماری قسمت

مدھیہ پردیش کے ایک گاؤں میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے گاؤں والے انہیں ملا جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

مُلّا جی مسجد کے پیش امام تھے اور موٴذن بھی۔ گاؤں کے بچوں کو سپارے اور قرآن شریف بھی پڑھاتے تھے مسجد کی تمام دیکھ بھال بھی انہیں کے ذمہ تھی۔ ملا جی بہت محنتی باحوصلہ نیک وشریف آدمی تھے۔ طبیعت ہشاش بشاش اور انتہائی خوش مزاج وصبر وشکر والے دیکھنے میں بہت خوبصورت نورانی چہرہ واضح ناک نقشہ ذہانت سے بھرپور چمک دار آنکھیں جو ہمیشہ نیچے جھکی رہتی تھیں۔

گاؤں کے قاعدے کے مطابق بیچارے ملا جی گاؤں والوں کے یہاں ایک ایک دن گھروں پر جا کر کھانا کھایا کرتے تھے مسجد سے مقرر کچھ تنخواہ بھی مل جایا کرتی تھی لیکن وہ کافی نہیں ہوتی تھی ملا جی کھانے پینے کے بہت شوقین تھے مگر اچھا کھانا انہیں کم ہی ملتا تھا مسجد کے پاس ہی ایک آفیسر سلیم صاحب کا گھر تھا جس میں سلیم صاحب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے جو مہاراشٹر سے سروس کے لئے مدھیہ پردیش آئے تھے ان کی پوسٹنگ اس گاؤں میں ہوئی تھی جس کا نام بگرودہ تھا۔

سلیم صاحب کی بیوی اچھے اچھے کھانے پکاتیں لذیذ کھانوں کی خوشبوئیں اُڑتی رہتیں۔ سلیم صاحب نمازی تھے چنانچہ روز ملّا جی سے مسجد میں ملاقات ہوتی۔

ملا جی نے سلیم صاحب کا وجود اپنے لئے باعث رحمت پایا اور سلیم صاحب کے یہاں اپنی آمد و رفت بڑھائی سلیم صاحب ملا جی کو کھانے ناشتہ و چائے وغیرہ پر بلا لیتے ۔ان کے گھر پر بیٹھک ہوتی اور بھی مسجد سے کئی نمازی جمع ہو جاتے ۔ملا جی ہر چھوٹے بڑے کام کرنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے ۔دوڑ دوڑ کر خوشی خوشی سلیم خان صاحب کے گھر کا کام کرتے اور خوب تعریفیں کر کر کے کھانا کھاتے ۔اس خوش مزاجی سے ملا جی کی خان صاحب کے گھر پر جگہ بن گئی ۔

ایک دن ملا جی کو لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ خان صاحب کے بنگلے کے سامنے کافی بڑی جگہ ہے فینسنگ کی ہوئی ہے یہاں آپ سبزیاں لگائیں جو سبزیاں پیدا ہونگی ان کو بیچ کر آپ پیسے حاصل کرنا اور اس طرح سبزی کی تجارت شروع ہو جائے گی اور دھیرے دھیرے کر کے آپ کا کاروبار بڑھ جائے گا ۔یہ بات ملا جی کے دل میں گھر کر گئی اور وہ اس کام میں جٹ گئے ۔

ملا جی نے سوچا کہ ٹماٹر سب سے مہنگا ہے پھر لگتا بھی جلدی ہے اور ٹماٹر زیادہ پیدا بھی ہوتے ہیں اس لئے میں اچھی کوالٹی کا ٹماٹر ہی لگالوں اس سے مجھے بہت سے پیسے مل جائیں گے ۔چنانچہ ملا جی نے سب سے پہلے ۔لان کی بنجر زمین کو سبزی اگانے کے لائق بنانے کے لئے خوب کھدائی شروع کردی دن رات کوئیں سے پانی لالا کر ڈالتے اور زمین کو سنوارتے رہے پھر کچھ پیسے جمع کر کے شہر کے بازار سے اعلیٰ قسم کے ٹماٹر کا بیج خرید کر لائے ۔خوشی خوشی ٹماٹر کی کھیتی کرنے چلے ۔بیج بودئے ہر صبح شام مسجد کے کوئیں سے کھینچ کھینچ ملا جی بالٹیاں بھر بھر کے پانی لاتے اور پانی ڈالتے آخر ٹماٹر کے پودے نکل آئے اور تیزی سے بڑھنے لگے ۔اب تو ملا جی کا

دل باغ باغ ہوگیا اور وہ دل ہی دل میں اپنے ٹماٹروں کی فصل کے بارے میں سوچا کرتے اور سب سے کہتے اب دیکھنا ٹماٹر کی فصل کیسے لہلہاتی ہے گاؤں کی منڈی کے لوگ بھی میرے پاس ٹماٹر خریدنے آئیں گے لیکن میں اپنے قیمتی ٹماٹر انکو نہیں دیا کروں گا کیونکہ گاؤں میں تو ٹماٹر سستے بکتے ہیں اور ان کی کوالٹی بھی ہلکی ہوتی ہے۔

لڑکے جمع ہو جاتے اور ملا جی کی باتوں کا مزا لیتے۔ ملا جی کو چڑھاتے ہاں دیکھنا اب ملا جی بھی بڑے پیسے والے آدمی ہو جائیں گے ملا جی خوش ہو کر کہتے ہاں اب دیکھنا میرے بھی دن بدل جائیں گے میرا ٹماٹر اونچی نسل کا ہے۔ شہر میں اس کی گاڑی بہت مہنگی بکے گی۔ اس کی آمدنی سے میں شہر میں ایک گھر خرید لونگا پھر میں ابھی بوڑھا بھی تو نہیں مجھے ایک گھر والی کی ضرورت ہے۔

وہ میری زندگی کا سہارا ہوگی میں نکاح کرلوں گا میرے دو تین بچے ہو جائیں گے زندگی مزے سے گذرے گی اچھے اچھے کھانے پکوان طرح طرح کی دعوتیں ہوا کریں گی بچے میرے پاؤں دبائیں گے بیوی خدمت کرے گی میری زندگی میں بہار ہی بہار ہوگی۔

ٹماٹر کی فصل جب تک ختم ہوگی میرے پاس پیسہ ہی پیسہ ہوگا کھانا پکانے کے برتن پلنگ بستر ضروری سامان کچھ کرسیاں میز سب کچھ ہوگا پھر کون مجھ سے نکاح کرنے پر راضی نہ ہوگا سلیم خان صاحب کے ورانڈے میں بیٹھ کر ملا جی اپنے پودوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور کہتے صاحب جی کیسے ٹماٹر لگیں گے۔

اگر میں صاحب لوگوں کی ٹیبل پر سجا کر ایک ٹماٹر رکھ دوں گا تو انہیں سب یاد نہ آوے گا۔ ٹماٹر ٹیبل کی ایسی شوبھا بنے گا جس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ کھانے میں

سب سے بڑھ کر دیکھنے میں گلاب سے زیادہ حسین میرے تازہ ٹماٹر کی بات ہی کچھ اور ہوگی دیکھنا صاحب جی طبیعت خوش ہوجائے گی صاحب لوگ مجھ سے ٹماٹر مانگیں گے۔

سلیم صاحب مسکراتے اور ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے حوصلہ بڑھاتے آخر ٹماٹر کے پودے کافی بڑے ہو گئے لیکن ٹماٹر لگنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ملا جی مطمئن تھے اچھا بیج ہے اونچی ذات کا بڑا ٹماٹر ہے آرام سے دیر میں ٹماٹر آئے گا پھر دِنوں تک ٹماٹر لگیں گے اور خوب ہی لگیں گے۔

مئی جون کی سخت گرمی چلچلاتی ہوئی دھوپ پانی کی قلت لیکن ملا جی اپنا پسینہ بہا رہے ہیں مسجد کے کنوئیں سے کھینچ کھینچ کر پانی لاکر پودوں میں ڈال رہے ہیں کہ اب پھول کھلیں گے اب ٹماٹر لگیں گے۔آخر پودوں میں پھول آگئے اور ٹماٹر لگنا شروع ہو گئے۔اب ملا جی بہت خوش اور پر امید نظر آنے لگے یہاں تک کہ خوشی میں دو وقت کے بجائے تین وقت دوپہر کی تیز دھوپ میں بھی پانی ڈالنے لگے۔

لوگوں کے دل ہل جاتے ان کی محنت پر کبھی کبھی لوگ ان پر دل دکھاتے اور منع کرتے تو وہ مطمئن ہو کر کہتے۔گرمی میں میرے پودے مرجائیں گے خیر صاحب جیسے تیسے ٹماٹر کی فصل آگئی یہ فصل پیٹ کے پانی کی تھی کیونکہ موسم تو تھا نہیں یہ ملا جی کی محنت کا نتیجہ تھا۔

سب سے پہلے چار بڑے بڑے خوبصورت ٹماٹر نکلے۔دو ٹماٹر سامنے والے گھر میں رہنے والے ڈاکٹر کی میز پر لیجا کر رکھ دئے ڈاکٹر نے ملا جی کا دل رکھنے کے لئے مبارک کے ساتھ وہیں پانچ کا نوٹ دیا۔ملا جی نے دو ٹماٹر سلیم خان

صاحب کی ٹیبل پر سیب کے طور پر ملا جی کی خوشی کا لحاظ رکھتے ہوئے خان صاحب
نے ان کو پچاس روپے دھکو دئے اب ملا جی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا سارے
درختوں میں ٹماٹر لگے، لیکن افسوس صرف دو، دو تین، تین ٹماٹر دیکھنے والوں نے کبھی تو
ملا جی کا مذاق اڑایا کبھی ان کے دل میں رحم آیا ایک دن کچھ شریر نوجوان نے ملا جی
سے آکر کہا ملا جی میری بیل گاڑی شہر جارہی ہے تمہارے ٹماٹر تڑوا کر تیار رکھنا ملا جی
اب جھنجلائے ہوئے تھے انہوں نے یہ سن کر جھنجلاتے ہوئے کہا ”اجی
چھوڑو جی“ یہ سب۔
”یہ نہ تھی ہماری قسمت“

☆☆

واہ کلیم میاں واہ

آج کلیم میاں کی گردن کافی اونچی اٹھی ہوئی تھی چال ڈھال سب ہی کچھ بدل گئی تھی ،وہ بڑی تیزی اور پھرتی سے باہر جانے کی تیاری کرر ہے تھے وہ اپنی بیگم سے یہ کہتے ہوئے کہ گھر پر کوئی میرا فون آئے تو آپ ریسو کرلینا بازار کی جانب چل دیئے۔

وہ محلوں سے بازاروں سے گذر رہے تھے چہرہ ہشاش بشاش سفید جھک کلف دیئے ہوئے کرتے پائجامے میں ملبوس وہ بڑے پر وقار طریقہ سے سینہ تانے ہوئے بازار سے گذر رہے تھے۔

دکانوں کی طرف دیکھتے سبھی پہچان والوں کی دکانوں پر رکنا چاہتے پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ جاتے دل ہی دل میں کلیم میاں بہت خوش تھے۔آج ان کی برسوں کی خواہش پوری ہوئی تھی اخبار میں ان کا مضمون شائع ہوا تھا وہ سوچ رہے تھے میرا نام تو ویسے ہی مشہور ہے آج سب نے میرا مضمون پڑھا ہوگا اور سب نے میرے مضمون کی بیحد تعریف کی ہوگی ۔آج ہر ایک کے دل میں میری کتنی عزت بڑھ گئی ہوگی سب کہہ رہے ہونگے واہ کلیم میاں واہ واقعی کلیم میاں بہت اچھے مضمون نگار ہیں ان کی معلومات بہت وسیع ہے لکھنے کا انداز دلنشیں زبان وبیان میں دلکشی ہے۔ مضمون زندگی کی تازگی سے بھرپور ہے۔

آج تو کلیم میاں کا دل کھول کر سواگت کریں گے جب بھی وہ یہاں سے گذریں گے پلکیں بچھائیں گے ان کو بلائیں گے ان کے مضمون کی دل کھول کر تعریف کریں گے یہی نہیں ان کے اعزاز میں ایک ادبی جلسہ بھی منعقد کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

چلتے چلتے بازار میں جب کئی دوکانیں گذر چکیں اور کسی نے ان کو دیکھ کر آواز نہیں دی تو دل بجھ گیا۔ لیکن یہ خیال ہوا کہ ابھی صبح کے دس بجے ہیں کسی نے اخبار پڑھا ہوگا کسی نے نہیں اس لئے بہتر ہے پوچھ لیا جائے۔

کلیم میاں ایک کتابوں کی دوکان پر چڑھے اور اپنے دوکاندار دوست سے پوچھا کہ کیوں اعجاز میاں آپ نے آج کا ندیم پڑھ لیا اعجاز میاں نے کہا کلیم بھائی اب پڑھتا ہوں ابھی تک اخبار پڑھنے کی مہلت نہیں ملی۔ کیوں کیا آج کے اخبار میں آپ نے کچھ خاص خبر پڑھی ہے کلیم میاں نے ٹھنڈی سانس بھری لیکن پھر گرم جوشی سے بولے ارے خاں اس میں میرا ایک مضمون چھپا ہے۔ اعجاز میاں نے خوش کن لہجے میں مبارک باد دی اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ اب میں اطمینان سے بیٹھ کر آپ کا مضمون پڑھونگا۔

کلیم میاں آگے بڑھے اور اپنے دوسرے دوست کی دوکان پر پھر پوچھنے لگے۔ ابرار میاں آپ نے آج کا ندیم دیکھ لیا انہوں نے سوال کیا کیا ہوا اس میں کیا خاص خبر ہے۔ کلیم میاں بیچاروں کو بتانا ہی پڑا کچھ نہیں میاں اس میں آج میرا مضمون آیا ہے۔ ابرار میاں نے مبارک باد دی اور کہا کہ ارے خاں ہم تمہارے مضمون ضرور پڑھیں گے آگے ایک کپڑے کی دوکان پر پہنچے طفیل صاحب کپڑے جما رہے تھے۔

کلیم میاں تیز قدموں سے ان کی جانب بڑھے طفیل میاں آپ نے آج کا اخبار پڑھ لیا طفیل میاں نے جواب دیا ارے نہیں میاں خیر تو ہے آج کوئی خاص خبر ہے۔ کلیم میاں دل ہی دل میں جھنجھلا گئے پھر بھی ہمت سے کام لیتے ہوئے بولے ارے میاں آج کے اخبار میں میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ طفیل صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اخبار پڑھنے کا وعدہ کیا۔

اب کلیم میاں ایک ہوٹل کی جانب روانہ ہو گئے جہاں اخبار کھلے رکھے رہتے ہیں آنے جانے والے اخبار پڑھتے ہیں ان کا دل باغ باغ ہو گیا جب انہوں نے ہوٹل کی میز پر اخبار رکھا ہوا دیکھا کلیم میاں کا نام ستارے کی طرح جھل ملا رہا تھا۔ ایک صاحب ان کے مضمون کا عنوان پڑھ رہے تھے۔ دوسرے صاحب نے جو آپس میں دوست تھے ہاتھ سے اخبار لیکر مضمون پڑھنا شروع کیا پورا مضمون پڑھا کلیم میاں بہت خوش تھے دور بیٹھے ہوئے خاموشی سے ان کو دیکھتے اور مسکراتے رہے جب مضمون پورا ہو گیا تو ایک صاحب نے دوسرے سے کہا ارے خاں مضمون تو اچھا لکھا ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ لکھنے والے صاحب کون ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ اگر ان کا پتہ بھی لکھا ہوتا تو اچھا تھا ان سے مل کر ان کے مضمون کی تعریف کر دیتے۔ بیچاروں کا حوصلہ بڑھ جاتا دل خوش ہو جاتا آج اچھے لکھنے والے ہیں کہاں؟ جو اچھا لکھتے ہیں ان کی پہنچ اخبار و رسالہ تک کہاں ہے۔ کوئی ان کی سفارش کرنے والا نہیں کہ ان کے مضامین مختلف رسائل و اخبارات میں شامل ہوں سچ ہے میاں لوگ کہتے ہیں کہ پر دینے والا ہونا چاہئے جب کوئی پر دینے والا ہوتا ہے جب تو وہ پرواز میں آگے نکل جاتا ہے۔ ورنہ اچھے اچھے شاعر و ادیب و افسانہ نگار گمنامی کے اندھیروں میں رہتے رہتے مٹی کے حوالے ہو جاتے ہیں جب ان کی تحریریں دیکھی و پڑھی جاتی ہیں تو عقل و ذہن سر دھنتے ہیں اور آہ واہ کرتے رہتے ہیں اب کیا

تھا کلیم میاں کا دل کھل گیا غنچہ سے گل ہو گیا لبوں پر مسرت کی مسکراہٹ پھیل گئی رنگ سرخ ہو گیا آنکھوں میں چمک آگئی وہ اپنی چمک دار ذہین آنکھیں کشادہ کرتے ہوئے ان دونوں دوستوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے پھر سلام عرض کیا اور فرمایا دوستوں یہ میرا مضمون ہے یہ مضمون میں نے لکھا ہے میں اخبار میں کئی کئی بار شائع ہونے کی غرض سے مضامین پہونچا تا رہا ہوں لیکن آج پہلی بار میرا یہ مضمون شائع ہوا ہے۔

پتہ نہیں کس کی مہربانی سے کس کی سفارش پر یہ مضمون سر چڑھ کر بول گیا۔
ان صاحبان نے کلیم میاں سے ہاتھ ملا کر ان کو مبارک باد دی اب کلیم میاں اس راز کو پا گئے اور اپنے مضامین پریس میں شائع ہونے کے لئے پہونچانا بند کر دیا۔ کیونکہ اب انہوں نے اپنے مضامین کی ایک مکمل کتاب شائع کروانے کا ارادہ کر لیا وہ کسی کی سفارش سے مضمون شائع کروانا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ اور نہ ہی انہوں اس کے لئے کسی سے التجا کی البتہ انہوں نے یہ بات دل ہی دل میں محسوس کر لی کہ اگر کہیں مضمون شائع ہونے کے لئے بھیجا جائے تو اس میں اپنی تصویر ضرور ہوتا کہ چہرے کی کتاب پڑھ لی جائے اور مضمون لکھنے والے کی اپنی پہچان ہو جائے۔ اور کبھی پرواز کے لئے کسی سے پر نہ مانگنا پڑے۔ ٹھیک ایک سال کے بعد کلیم میاں کے لئے وہ مبارک دن آیا کہ ان کے مضامین کی خوبصورت کتاب بازار میں آگئی اور ہاتھوں بک رہی ہے اور لوگوں کی زبان پر کلیم میاں کا ذکر اور ان کی تحریر کی تعریف ہے۔

دوستوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں ''واہ کلیم میاں واہ'' امر رہے گی آپ کی تحریر توصیف اور آپ کا نام۔

☆☆

برقعہ نہ ملا

گھر میں کام کرنے والی بائی شاکرہ نے جب نسرین بیگم سے برقعہ کی فرمائش کی تو نسرین بیگم کو بڑی حیرت ہوئی اور خوشی بھی، نسرین بیگم کا دل باغ باغ ہوگیا کہ شاکرہ کے دل میں پردہ کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ نسرین بیگم سوچنے لگیں اس کا ذہن دین کی طرف راغب ہوگیا ہے میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ تو دین کی تعلیم حاصل کرنے میرے پاس آجایا کر۔ ساتھ میں سہیلیوں کو بھی لے کر آیا کر۔ میں سب کو پڑھاؤں گی اگر میں مصروفیت کی وجہ سے نہ پڑھا سکی تو ایک استانی رکھ دونگی اس کی تنخواہ میرے ذمے رہے گی میں گھر کا ایک کمرہ اس کے لئے وقف کردونگی۔ نسرین بیگم نے شاکرہ سے مختلف سوالات کرنا شروع کردیا اور اپنی جانب سے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا شاکرہ تیرے دل میں برقعہ پہنے کا خیال پیدا ہوا یہ بڑا اچھا ہوا شاکرہ نے نسرین بیگم سے پھر برقعہ مانگا اور کہا کہ آپ مجھکو پرانا برقعہ ہی دے دیجئے لیکن وہ خوب لمبا اور بڑا ہو۔

نسرین بیگم نے اپنی الماری کھولی اور اس میں سے ایک برقعہ نکال کر شاکرہ کو دیدیا کڑھائی والا وہ برقعہ زیادہ پرانا بھی نہ تھا دیکھنے میں خوشنما معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ہی شاکرہ کے ہاتھ میں برقعہ آیا تو شاکرہ نے کڑھائی وسلائی وغیرہ پر دھیان نہ دیکر فوراً پہن کر دیکھا اور اس کی لمبائی پر زور دیا بیگم صاحبہ برقعہ میرے قد سے چھوٹا ہے اس میں میرے دوبالشت پیر دِکھ رہے ہیں۔

نسرین بیگم نے کہا ابھی سے تو اتنی پردے والی ہوگئیں کہ تیری شلوار بھی نہ دکھے۔ ابھی سے یہ پہن لو پھر جب عادت ہوجائے گی تب میں تیرے لئے ایک لمبا سا برقعہ بنوا دونگی۔ تھوڑی دیر کشمکش کے بعد شاکرہ نے وہ برقعہ وہیں پر چھوڑ دیا اور کہا نہیں یہ برقعہ ٹھیک نہیں رہے گا اگر یہ لمبا ہوتا تو میں گھر لے جاتی۔

شاکرہ کے ذہن میں یہ بات گھوم رہی تھی کہ میری سہیلیوں نے نئے برقعے بنوائے ہیں جس میں ان کے ہاتھ پاؤں سب ڈھک جاتے ہیں اور چہرے کو وہ اس طرح چھپالیتی ہیں کہ کوئی ان کو پہچان ہی نہیں سکتا اس طرح میری سہیلیوں کا گروپ جہاں چاہے چلا جاتا ہے کوئی ان کو پکڑ نہیں سکتا کوئی بدنامی کا داغ نہیں لگا سکتا۔ وہ پہچان میں نہیں آتیں یہاں تک کہ پیروں میں موزے ہاتھوں میں دستانے پہن لیتی ہیں اسی طرح رضیہ، فہمیدہ، آشا، گیتا، سادھنا، وغیرہ بھی منہ ہاتھ چھپا کر گاڑیوں پر بیٹھ بیٹھ کر جانے کہاں کہاں چلی جاتی ہیں کوئی ان کو پہچان ہی نہیں سکتا برقعہ و پردہ بہت اچھا طریقہ ہے کہیں بھی جانے میں کوئی دقت نہیں آتی۔ اس کے بعد شاکرہ نے کبھی دین سیکھنے کی یا پڑھنے لکھنے کی بات نہیں کی۔

نسرین بیگم اس کی چاہتوں کا اندازہ لگا چکی تھیں وہ سمجھ گئیں کہ شاکرہ پر ضرور کوئی غلط سوسائٹی کا اثر ہوگیا ہے یہ غلط گروپ میں شامل ہونا چاہتی ہے وہ سوچنے لگیں کہ اچھا ہوا کہ شاکرہ کو اپنی غلط چاہتوں کے لئے لمبا برقعہ نہ ملا۔ نسرین بیگم اس کے ذہن کے دائرے میں پھیل گئے اور وہ سماج کے بگڑے ہوئے حالات و مسائل کو سلجھانے کی فکر میں مصروف ہوگئیں۔

☆☆

اُن دنوں سے یہ دن اچھے ہیں

شاہد ان دنوں اپنی ممی کی طرف زیادہ ہی متوجہ تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ آج کل ممی صبح صبح جلد از جلد چائے پینے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کر کے کنگا چوٹی کر کے ہر طرح تیار ہو کر بیٹھ جاتی ہیں روز روز یہ دیکھ کر شاہد نے اپنی ممی سے پوچھا ’’ممی آپ آج کل اتنے جلدی تیار ہو کر کیوں بیٹھ جاتی ہیں جبکہ پہلے آپ ناشتہ کر کے اخبار پڑھ کر T.V. پر نیوز سُن کر آرام سے تیار ہوتی تھیں۔

شہناز بیگم شاہد کی ممی نے شاہد کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر بتایا کہ بیٹا آج کل اپنے گھر میں ایسی نوکرانی نہیں آرہی ہے جو صبح صبح تیار ہو کر سج دھج کر کام کرنے آتی ہے۔ پریس کئے ہوئے بہت ڈزائنوں والے خوبصورت سوٹ پہنے ہوئے بلکہ کانوں میں سوٹ سے میچ کرتے ہوئے بندے اور گلے میں ہار پہنے رہتی ہے۔ چوڑیاں بھی روز بدل بدل کر پہنتی ہے۔

شاہد حیرت سے سن رہا تھا پھر بولا جی ہاں ممی آپ سچ کہہ رہی ہیں میں نے بھی اس کو چیک کیا ہے وہ بہت سج دھج کر آتی ہے مگر میں نے اس کی ہر چیز پر دھیان نہیں دیا۔ لیکن آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

ممی نے کہا اب بتلاؤ شاہد نوکرانی کو میں منع تو کر نہیں سکتی کہ تو بن سنور کر نہ آیا کر بلکہ مجھ کو اسے دیکھ کر تسلی ہی ہوتی ہے کہ شکر خدا اللہ نے سبکو نوازا ہے۔ شاہد کی

ممی نے مزید کہا کہ شاہد ایک دن میں نے اپنی نوکرانی ناظمہ سے پوچھ ہی لیا کہ ناظمہ تم اتنے اچھے کپڑے کہاں سے خرید تی ہو؟ تم کافی کما لیتی ہو اور تم کو وقت بھی مل جاتا ہے کہ جو زیورات سے بھی آراستہ نظر آتی ہو چاہے وہ نقلی ہی کیوں نہ ہوں لیکن زیور بھی بڑی میچنگ سے پہنتی ہو۔

ناظمہ نے جواب دیا'' بیگم صاحبہ آپ جیسی رحم دل مالکین ہم لوگوں کو اپنے اچھے اچھے سوٹ دیدیتی ہیں ہم ان کی خدمت کرتے ہیں تو وہ خوش ہو کر اچھے اچھے اور نئے نئے کپڑے دیدیتی ہیں خدا آپ لوگوں کو سلامت رکھے۔

اُس نے پھر کہا کہ یہ چوڑیاں وہار بُندے وغیرہ یہ ہم اپنے پیسوں سے خرید لیتے ہیں چوٹی میں لگانے والے بوکلپ ہار بندے رنگ برنگے موتیوں کے سیٹ پیتل کی انگوٹھیاں یہ سب اتنے مہنگے نہیں ہوتے یہ شوق کی چیزیں ہم اپنے پیسوں سے خرید لیتے ہیں اسی لئے ہم کو اپنی تنخواہ کا انتظار رہتا ہے کہ تنخواہ ملے تو ہم بازار جا کر اپنے سوٹوں کے ساتھ میچنگ کر کے مہینے بھر کے لئے ہار بندے چوڑیاں وغیرہ لاکر رکھ لیں۔

کھانے پینے کے لئے تو ہم کو آپ لوگوں سے روٹی و سالن کی بہت مدد مل ہی جاتی ہے۔ خدا آپ لوگوں کو اچھا رکھے اور خوب دے آپ لوگوں کی وجہ سے ہمارے گھروں میں خوشحالی آئی ہے جو ہم لوگ صبح صبح سج دھج کر آپ لوگوں کے گھروں میں کام کرنے کے لئے نکل جاتے ہیں۔ راستے میں ہماری سہیلیاں ایک دوسرے پر نظر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے کے کپڑے لتے اور زیور دیکھتی ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم خوش ہو لیتے ہیں۔

بیگم صاحبہ نے ایک دن ناظمہ سے پوچھا ناظمہ تمہاری شادی طے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں آخر تمہاری شادی کیوں نہیں ہو رہی ہے اب تو تمہاری شادی ہو جانا چاہیئے۔ ناظمہ کا ہشاش بشاش چہرہ اداسی میں تبدیل ہوگیا وہ رنجیدہ ہو کر بولی بیگم صاحبہ شادی تو ہو جائے گی لیکن شادی کے بعد ہماری آزادی ہماری خوشیاں اور سہیلیوں سے ملنا جلنا رہنا بولنا گھومنا پھرنا یہ سب بند ہو جائے گا گھر کی فکر شوہر کا ڈر بچوں کا خیال جیتے جی ہم کو مار ڈالے گا اگر کسی کے گھر کام کرتے کرتے دیر ہو جائے گی تو شوہر پوچھے گا کیوں دیر کیوں ہوگئی کس سے ملنے چلی گئی تھی۔ کہاں ہوا کھا رہی تھی کس ک ساتھ تھی تو وغیرہ وغیرہ۔ کپڑے پریس کر کے پہنیں گے تو کہے گا کس کو دکھانے چلی ہے ہار بندے و چوڑیاں پہنیں گے پھر یہی سوال ہو گا کس کے لئے سج کے چلی ہم تو گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں دیکھ تو جلدی آنا راستے میں کوئی مل جائے تو تو اس سے کھڑے ہو کر باتیں نہ کرنا چاہے وہ تیرا رشتہ دار ہو یا تیری سہیلی تیرے بچوں کو میں کب تک سنبھالوں گا جلدی جلدی کام کر کے تو جلدی سے گھر آ جانا۔

ناظمہ نے اپنی دلیلیں جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بیگم صاحبہ جب ہم لوگ جلدی جلدی کام کرتے ہیں اور گھر جلدی جانے کا خیال ہمارے اوپر سوار رہتا ہے تو کام بھی صحیح نہیں ہو پاتا برتن ہاتھوں سے گرتے ہیں مالکن کی ڈانٹیں سننا پڑتا ہے ہر دن کاموں پہ اعتراض سنیں اور ان کے کام جب اچھی طرح نہیں ہو پائیں گے تو وہ ہم سے خوش ہی نہیں ہو سکیں گی اور نہ ہی ہم کو کوئی اچھے کپڑے جوتے سینڈلیں وغیرہ دیں گی اس طرح ہماری حالت بھی اچھی طرح نہیں دِکھے گی۔ گھر پہنچ کر میاں کی

ڈانٹیں کھانے کا ڈر ہمارے چہرے پر منڈلاتا رہے گا۔

یہی نہیں مہینے پر جب ہمیں تنخواہ ملتی ہے تو ہم لوگوں کے یہاں مرد اس کا حصہ دار ہو جاتا ہے کوئی آدمی شرابی ہے تو شراب کے لئے چاہئے کوئی جواری ہے تو جوا کھیلنے کے لئے چاہئے ورنہ پٹائی ہوگی ۔اس قسم کی ہزاروں باتیں ہیں میں آپ کو کیا کیا بتاؤں؟ یہ کہتے کہتے ناظمہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

وہ کہنے لگی کہ اچھا ہے ابا ابھی رکے ہوئے ہیں کہ پیسے کا انتظام نہیں ہو رہا ہے جس سے کہ لڑکی کی شادی ہو ہم کہتے ہیں جتنے دن پیسوں کا انتظام نہ ہو اتنا ہی اچھا ہے کم سے کم ان دنوں ہم لوگ خوش تو رہتے ہیں اپنے کام کرنے کے بعد ہنس بول لیتے ہیں کھا پی لیتے ہیں من مانی جی لیتے ہیں شادی کے بعد کے دن اور ہیں اس لئے ہم یہی کہتے ہیں کہ ''ان دنوں سے یہ دن اچھے ہیں''

یہ سنکر شہناز بیگم کا دماغ سماج کے بے روزگار بد کردار کاہل وست مردوں کی طرف دوڑ گیا جس کی وجہ سے کرسک و محنتی خواتین کی بھی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ۔چاہے وہ آفس و اسکول میں کام کرنے والی پڑھی لکھی خواتین ہوں یا گھروں میں کام کرنے والی ان پڑھ جاہل عورتیں زیادہ تر خواتین کو ان باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔محنت کر کے بھی ان کی زندگی میں بھرپور خوشیاں و مسرتوں کے لطیف احساس نہیں۔!

☆☆

ہلچل

خوبصورت الفاظ لکھنے والا قلم نہیں رہا جذبات سرد ہوگئے وہ شوخیاں وہ قہقہے وہ چہچہے نہ رہے رومانی کہانیاں دلفریب اندازِ بیاں وہ حسین تفریحات دلچسپ باتیں وہ خوبصورت ملاقاتیں دوستوں سے ملنے کا اشتیاق کچھ بھی نہ رہا آپا اس قدر خاموش کیوں ہوگئیں؟

جب رخسانہ نے اپنے اپا سے پوچھا۔ آپا جان ایک سرد آہ بھر کر رہ گئیں پھر رخسانہ نے دوبارہ اپنا یہی سوال دہرایا آخر آپا نے یہ شعر پڑھ دیا۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگارِ طاق نسیاں ہوگئیں

آپا اس کی وجہ کیا ہے آج میں جان کر ہی رہوں گی رخسانہ نے اپنی آپا جان سے کہا آپا جان نے پھر یہ شعر پڑھ دیا۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دلے اور دل ان کو جو نہ دیں مجھ کو زباں اور

رخسانہ نے اپنی آپا سے کہا اشعار میں نہیں آپا نثر میں جواب دیجئے۔ آپ کی خاموشی اور بیحد سنجیدگی و اُداسی مجھ کو اچھی نہیں لگتی آپ کی پر بہار شخصیت میں انجمنیں موجود ہوا کرتی تھیں آج یہ خاموش نگاہیں سنجیدہ چہرہ میں پھیکی پھیکی سی ہنسی کیوں ہے؟ محفلوں میں رنگ جمانے والی آپا آج اداس کیوں ہیں آج کل آپ نے

محفلوں میں آنا جانا کم کیوں کر دیا ہے؟ ہر ایک شادی پھیکی پھیکی سی لگ رہی ہے۔

کیونکہ آپ کی کمی خاندان کی ہر ایک بہن کو محسوس ہو رہی ہے خدارا زندگی یوں نہ گنوائیں اپنی خوش مزاجی سے روتے ہوئے کو ہنسا دینے والی خوبصورت وشگفتہ طبیعت کی مالک میری آپا کو کیا ہو گیا ہے؟ آپا نے پھر ایک شعر پڑھ دیا۔

ہو چکیں غالبؔ سب بلائیں تمام

اِک مرگ ناگہانی اور ہے

میری پیاری آپا زندگی سے یہ مایوسی کیوں ہے؟ زندگی مختصر ہے یا طویل یہ آپ نہیں بتا سکتیں پھر آپ اس خوبصورت زندگی کے ختم ہونے کے انتظار میں دنیا سے بے نیاز ہو کر ایک گوشے میں کیوں بیٹھ جانا چاہتی ہیں رخسانہ نے کہا آپا اس بات پر کوئی جواب نہ دے سکیں اب آپا سوچ میں پڑ گئیں کہ کیا جواب دیا جائے آخر میں آپا نے کہا۔

رخسانہ میری پیاری چھوٹی بہن بات دراصل یہ ہے کہ میں جب جو چاہتی تھی کر لیتی تھی میری خواہش پوری ہو جاتی تھیں زندگی اور لوگ سب میری مرضی کے تابع تھے لیکن شوہر کی آنکھ جب سے بند ہو گئی دل پھیکا ہو گیا اگر چہ میں پھر بھی کامیابی سے زندگی نبھا رہی ہوں زندگی سے دل لگانے کی کوشش کر رہی ہوں لوگوں سے مجھے عزت بھی ملتی ہے لیکن اب خواہشیں ادھوری رہ گئیں ہیں۔ بیٹی کی شادی ہو گئی میری تنہائی کا کوئی ساتھی نہیں بگڑے کاموں کو کوئی بنا نہیں سکتا جو میں کرنا چاہتی ہوں وہ ہوتا نہیں ہے اس لئے میں اب خاموش رہتی ہوں اور اب اپنی زندگی کے ختم ہونے کا انتظار ہے۔

رخسانہ اپنی آپا کا یہ جواب سنکر تڑپ اٹھی اس کے دل و دماغ میں تیزی

وپھرتی آگئی اور وہ اپنے ذہن و دل کے دریچے کشادہ کر کے اپنی آپا کو بڑے فلسفیانہ انداز میں طرح طرح سے دلیلیں دیکر سمجھاتی رہی نہیں آپا یہ غلط ہے آپ نے یہ غلط طریقہ اختیار کیا ہے آپ کو پھر میدان میں آنا ہے ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک''

جتنی زندگی ہے اسے ہنس کر بتانا ہے رو کر نہیں اداس و خاموش ہو کر نہیں ہمت و حوصلے سے آپ اپنی چاہتیں اور ارمان سب پورے کر سکتیں ہیں ہر عمر میں زندگی کو جوان رکھنا چاہیے حرکت میں رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے زندگی کے بارے میں فرمایا ہے:

تُو اِسے پیمانۂ اِمروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی

دنیا میں بھیڑ بھاڑ ہے آبادی کا سمندر ہے آپ اس سمندر سے ہزار کیا بیشمار بوندیں حاصل کر سکتیں ہیں آپ جس کو پیار سے بلائیں وہ آپ کی جانب کھنچتا ہوا چلا آئے گا پیار و محبت کی کشش اُسے آپ کی طرف بلالے گی۔ کسی کو پیار چاہیے کسی کو روٹی چاہیے کپڑا اور مکان چاہیے آپ کو ایک دوجے کا ساتھ اپنی خدمت اور اپنے گھر میں انسانوں کی آبادی۔

یہ سنکر آپا کا دل تازہ گلاب کی مانند کھل اُٹھا ان کے دماغ میں ہل چل ہونے لگی تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچ میں ڈوبی رہیں پھر اپنی چھوٹی بہن رخسانہ کا ہاتھ ہاتھ میں لیکر چوم لیا اور مسکراتی ہوئی گویا ہوئیں رخسانہ تم بہت سمجھدار ہو تم نے مجھکو خوش رہنے کا انداز سکھادیا اب مجھے اپنی مرجھائی ہوئی زندگی میں خوشگوار ہل چل محسوس ہونے لگی ہے۔

☆☆

ارمانوں کا خون

فائزہ پڑھنے لکھنے کی بہت شوقین تھی۔ وہ بڑی محنت سے پڑھا کرتی تھی۔اگرچہ فائزہ کے والدین نہایت مفلس نادار اور غریب تھے لیکن انہوں نے اپنی اس بچی فائزہ پر خاص توجہ صرف کی اور اس کی پڑھائی جاری رکھنے کا اِرادہ طے کیا۔ ایک بڑی بیٹی کی شادی کردی گئی تھی ایک بیٹی فائزہ سے چھوٹی تھی ان میں سب سے بڑا ایک بڑا بیٹا تھا جو اپنی پڑھائی مکمل کر چکا تھا۔اورنوکری کی تلاش میں مصروف تھا۔

والد صاحب غفران علی کے عرب چلے جانے پر حالات بہتر ہو گئے تھے ۔بچوں کی پرورش وشروع کی تعلیم بہتر طریقے سے ہوگئی۔لیکن عرب میں غفران علی ایک حادثہ کا شکار ہو گئے اس لئے ان کو اپنی سروس چھوڑ کر اپنے ملک واپنے شہر واپس آنا پڑا۔یہاں وہ کچھ نہ کچھ تھوڑا بہت پرائیویٹ کام کرلیا کرتے تھے۔ جس سے گذر بسر ہوتی رہی ۔تعلیم کے اخراجات بڑھتے گئے ۔مالی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ان حالات میں غفران علی کے رشتہ دار جو اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے غفران علی کی مدد کرتے ان کے بچوں کی پڑھائی لکھائی کے خرچے برداشت کرتے ایک لڑکی نے ہائی اسکول پاس کرلیا تھا رشتے داروں نے مل جل کر اس کی شادی کردی۔

بڑا بیٹا ایم کام کر چکا تھا تیسرے نمبر کی بچی فائزہ B.S.C. پارٹ ون

کی طالب علم تھی۔غفران علی کی یہ لڑکی سہیلیوں میں رہ کر بہت تیز ہوگئی تھی۔وہ اپنی سہیلیوں کے گروپ میں ہمیشہ کبھی کالج میں کبھی گراؤنڈ میں گھومتی رہتی۔گھر پر آکر پڑھائی میں مصروف ہوجاتی۔گھر کے کام کاج میں اس کو قطعی دلچسپی نہ رہی۔بوڑھی وضعیف دادی گھر کے کاموں میں بہو کا ہاتھ بٹاتیں۔فائزہ اور اس کی چھوٹی بہن رخسانہ کو پڑھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ان دونوں بہنوں کو گھر کے خانہ داری کے ضروری کاموں میں بھی دلچسپی نہ ہوتی۔پڑھائی کے علاوہ فائزہ اپنا سارا وقت سہیلیوں سے باتیں کرنے میں گذار دیتی۔

سہیلیوں کے آنے جانے ہوتے۔تفریحات کا بھی پروگرام بنتا اور وہ اپنی سہیلیوں کے گروپ میں بیحد خوش اور مصروف رہتی۔موبائل کے اخراجات کالج جانے کے لئے آٹو کے اور ٹیوشن کے اخراجات پرائیویٹ کالج کی فیس کتابوں و کاپیوں وغیرہ کے خرچے بڑھ گئے۔لیکن لڑکیاں دن بدن اپنی تفریحات وضروریات کو کم کرنے کا نہ سوچتیں،خرچوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

آخر عزیز ورشتے دار جو اپنی بھتیجیوں کی پڑھائی لکھائی وغیرہ پر خرچ کرتے اب اس فکر میں مبتلا ہو گئے کہ فائزہ کے ہاتھ پیلے کردینا چاہئے زمانے کی ہوا خراب ہے لڑکیاں بہت آزاد ہوگئیں ہیں اپنی اپنی مرضی سے کہیں بھی گھومنے تفریح کرنے نکل جاتی ہیں۔

فائزہ کے عزیز ورشتے داروں نے یہ طے کرلیا کہ اب فائزہ کی شادی کردی جائے۔اگر لڑکے والے اس کو آگے پڑھائیں گے تو بہتر ہے۔ورنہ شادی تو کرہی دی جائے ماں باپ پر بوجھ کم ہوگا اور جوان بچی کی فکر بھی دور ہوگی۔

چنانچہ تلاش و جستجو جاری ہوگئی کہنا سنا چلتا رہا رشتے آنا شروع ہو گئے لیکن ہلکے لوگوں کے رشتے غیر تعلیم یافتہ رشتے جو پسند نہیں آتے ۔ آخر ایک شریف خاندان کا خوبصورت تعلیم یافتہ لڑکا فیضان احمد اپنی امی کی چاہت پر فائزہ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوگیا ۔ حالانکہ فیضان کی امی کئی لڑکیاں دیکھ چکی تھیں ۔ اچھے گھرانوں کی اچھی اچھی لڑکیاں ۔ لیکن کچھ نہ کچھ خامیاں دکھائی دیتیں اور قسمت کہیئے یا اتفاق ناپسند کردی جاتیں ۔ آخر فائزہ بھی اپنے گھر کی پریشانیوں سے گھبرا گئی اور اس کو شادی کے لئے آمادہ ہونا پڑا ۔ اس کی پڑھائی مکمل کرنے کا لڑکے والوں سے وعدہ لیا گیا ۔ وہ راضی ہو گئے ۔ فائزہ دبلی پتلی سانولے رنگ کی پُرکشش لڑکی تھی ۔

لڑکی لڑکے والوں کے سامنے انتہائی مسکین سیدھی و معصوم صورت بنا کر آئی مفلسی کے حالات لڑکے کی امی کے ریحانہ بیگم سامنے پہلے سے ہی تھے انہوں نے رحم ہمدردی اور محبت میں ڈوب کر لڑکی کی کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے معصوم سمجھ کر لڑکی کو پسند کرلیا ۔

آخر سکون کی سانسیں لی گئیں فائزہ کی شادی کی تیاریاں ہوئیں دونوں جانب مسرت کی لہر دوڑ گئیں امیدوں و آرزؤں میں رنگ بھرنے لگے دل و دماغ میں ارمانوں کی بارات سجنے لگی ۔ ریحانہ بیگم خوش تھیں کہ فائزہ ہمارے گھر آکر خوش رہے گی لڑکی والوں سے لڑکے والے ہر طرح بہتر تھے یہ سوچ کر سب مطمئن تھے کہ لڑکی عمر بھی زیادہ نہیں ہے دبلی پتلی سلونی لڑکی ہے دوڑ دوڑ کر کام کرےگی اور پڑھائی کی جو شرط قبول کی ہے B.S.C.Final کی وہ بھی کروالیں گے ۔

فیضان اپنے گھر میں سب سے بڑے صاحبزادے تھے جو سمجھ دار و معتبر اور تعلیم یافتہ تھے دو بھائی اور ایک بہن تھیں جسکی شادی ہو چکی تھی۔ گھر میں ریحانہ بیگم اور ان کے شوہر عمران احمد بھی پڑھے لکھے تھے۔ عمران علی کی سرکاری نوکری تھی اور دو مکانوں کا کرایہ آتا تھا مل جل کر اچھی طرح گذر بسر ہو جاتی تھی فیضان احمد نے M com کرنے کے فوراً بعد ہی متوسط حالات میں ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں سروس کر لی اور کوچنگ کلاسیز میں بھی پڑھانا شروع کر دیا وہ اپنے حالات سے مطمئن تھے۔

فیضان احمد کی ارمانوں سے شادی ہو گئی دولہا دلہن گھومتے پھرتے تفریح کرتے کھاتے پیتے مسکراتے آئندہ زندگی کے سپنے سجاتے۔ کچھ مہینے گذر چکے تھے۔ فائزہ کا B.S.C.P.I کا رزلٹ آگیا وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی اب اسکو کالج کھلنے کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ وہ اپنا سِلیبس لائی کتابوں کاپیوں وغیرہ کی فرمائش شروع ہو گئی۔ اس کے سوا اس کو گھر کا کوئی دھیان ہی نہ تھا کہ میں کسی کی بیوی کسی کی بہو کسی کی بھابی وغیرہ ہوں کام کی طرف اس کی توجہ بھی نہ تھی گھر میں کیا ہونا ہے کیا ہو رہا ہے کیا چاہیئے کیا نہ چاہئے اس کے متعلق اس کو اس کا بھی احساس نہ تھا۔

وہ صبح اٹھتی چائے کھانا ناشتہ پھر نہانا کپڑے پریس کر کے پہن کر سج دھج کر آٹو میں بیٹھ کر کالج چلے جانا۔ شام کو آتی سکھانے کے بعد یہ نوبت آتی کہ گھر والوں کو سلام کیا اور اپنے کمرے میں اندر ہو گئی کئی دنوں تک یہ رہا پھر کچھ کہا سنا ہوا تو مجبور آ کر شام کی ہنڈی اس نے اپنے ذمہ لے لی۔

ریحانہ بیگم نے ارمانوں سے اپنے بیٹے کی شادی کی کہ چھم چھم کرتی ہوئی

بہو گھر میں چلے گی گھومے گی کام کرے گی میں اکیلی رہتی ہوں ہر طرح میرا خیال کرے گی باتوں سے ہی میرا دل بہلائے گی میں بھی ٹیچر رہ چکی ہوں ایم اے پاس ہوں دنیا کی باتیں میرے ذہن میں ہیں۔ میں نے سروس چھوڑ دی لیکن آج بھی میری نالج بہت ہے۔افسانے کتابیں اخبار وغیرہ پڑھے بغیر میں رہ نہیں سکتی اچھے اچھے قابل لوگ مجھ سے شوق سے گفتگو کرتے ہیں اور معلوماتی نئی باتیں مجھ سے پوچھتے ہیں آخر میں بھی ڈبل ایم اے ہوں۔

یہ باتیں سوچ کر وہ اپنی آئندہ زندگی کو پر سکون محسوس کرتی تھیں۔لیکن ایسا ہوا نہیں وہ جس بہو کو غریب اور مسکین سمجھ کر بیاہ کر لیکر آئی تھیں وہ اِس کے برعکس نکلی۔انتہائی ضدی اپنے مطلب میں بہت ہوشیار کسی کی جانب دیکھنا نہ سنا کسی کا کوئی ادب نہ لحاظ۔

تقریبات میں ضرور خوب سج دھج کر خوشی خوشی جانا کھانا اور مزے اڑانا۔ اپنی ساس کا خیال نہ سسر کا خیال۔گھر میں پہلی بہو لانے کا بڑا ارمان ہوتا ہے لیکن ساس کا کوئی ارمان پورا نہ ہوا۔بلکہ "ارمانوں کا خون" ہوتا گیا۔

ریحانہ بیگم کی طبیعت پہلے سے ہی کچھ خراب رہتی تھی۔اب مزید خراب رہنے لگی اپنے گھر میں انہوں نے جو بہو کا تصور سجایا تھا وہ سچ نہ ہوا۔بہو انکی جانب رجوع نہ ہوئی اپنی پڑھائی اپنی تفریح اور میاں سے عارضی دل لگی وغیرہ چلتی رہی۔

کالج کھل گیا فائزہ نے اپنی کتابوں کی لسٹ فیضان کے ہاتھوں میں تھما دی اور خود بھی بازار جانے کے لئے تیار ہوگئی فیضان کی تنخواہ اور کوچنگ کی آمدنی بہت زیادہ نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے ہر طرح سے اپنی بیوی کے لئے تمام کتابیں مہیا کیں

نئی نئی کتابیں دلوائیں کالج کی فیس ٹیوشن وکوچنگ کی فیس آٹو کا خرچ وغیرہ سب برداشت کرتا رہا۔

اب فیضان کو اپنی امی و پاپا کے کاموں کا ذرا بھی وقت نہ ملتا نہ ہی فائزہ کبھی گھر والوں کی طرف متوجہ ہوئی نہ ان کا کوئی احساس کیا۔اس کے باوجود بھی ریحانہ بیگم اچھے دنوں کا انتظار کرتی رہیں۔کبھی لہسن چھیل رہی ہیں کبھی پیاز کبھی سبزیاں کاٹ رہی ہیں کیونکہ وہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی تھیں اس لئے سب تیار کر کے گیس کے سامنے کرسی لگا کر بیٹھ جاتیں اور مزے مزے کے کھانے جو وہ ابتدا سے ہی کھِلانے اور کھانے کی عادی تھیں اپنے میاں اور بچوں کے لئے تیار کرتیں۔اس کے بعد اپنی نمازوں وتسبیحات وقرآن شریف کی ان کو فکر رہتی اپنے کپڑے وغیرہ دیکھنے میں بھی ان کا کافی وقت لگ جاتا۔

اس طرح سارادن مشغولیت میں گذر جاتا جب شام کو گھر میں کالج سے آکر بہو داخل ہوتی تو اس کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی ہوتے۔ساس کے ساتھ بیٹھنا ان کی دل جوئی کرنا کچھ قصے کچھ واقعات سنانا ہنسانا نہ ہنسانا کچھ نہیں اپنے کمرے میں جا کر اپنے ہی اپنے کاموں میں مصروف رہنا۔

فیضان بھی یہ سب کچھ محسوس کرتا اور کبھی کبھی تکرار بھی ہوجاتی لیکن فائزہ اس سے بہت بحث کرتی جب تکرار کرتے کرتے دیر ہوجاتی اور B.P کی مریض ریحانہ بیگم سنتے سنتے بول اٹھتیں فیضان خاموش ہوجاؤ۔

دن گذرتے رہے آخر B.S.C.Part II nd کا رزلٹ آگیا بہو پاس ہوگئی ہے وہ دل میں بہت خوش تھیں کہ چلو جیسے تیسے سال تو گذر چکا ہے۔اب

ایک ہی سال رہ گیا ہے اس کا B.S.C.Final ہو جائے گا تو گھر میں سکون ہوگا پھر بہو گھر کے کاموں میں دلچسپی لیگی اور گھر میں آنے جانے والوں کو اور ہم لوگوں کو دیکھے گی۔ تھوڑا بہت جو بھی وہ کرے گی کم سے کم نظر کے سامنے تو رہے گی میرے کمرے میں وہاں میں تو آکر بیٹھے گی ایک سال اور اس کی پڑھائی کی وجہ سے خاموش رہ کر گذار لیتے ہیں۔ شام کو فیضان اسکول سے آئے تو اس کی امّی نے کہا فیضان تمہاری بیوی کا رزلٹ آگیا ہے تمہارے چھوٹے بھائی فرّخ نے اخبار میں رول نمبر دیکھ لیا ہے۔ وہ اب کالج سے آتی ہوگی میں نے فرّخ سے بہت اچھی مٹھائی اور خوبصورت گلاب کا موٹا ہا منگوا کر رکھ لیا ہے جب وہ گھر میں داخل ہوگی تو اس کو میں اپنے ہاتھوں سے مہکتا ہوا گلاب کا ہار پہناؤں گی جو کچھ بھی ہے آخر ہماری بہو ہے پھر وہ اپنی پڑھائی بھی تو کر رہی ہے۔ اس کی پڑھائی اپنے ہی کام آئے گی۔

اس کو سروس کرنے کا شوق ہے تو یہ تو اچھی بات ہے آج کل پڑھی لکھی لڑکیاں اپنے گھر کو اچھی طرح چلانے کے لئے اپنے گھر کا و بچوں کا معیار بڑھانے کے لئے سروس کرتی ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ ارے بیٹا میں نے بھی تو بیس سال سروس کی ہے چار بچوں کو تیار کر کے تانگے میں بیٹھا کر اسکول لے جاتی تھی جب وہ چھوٹے تھے تو کپڑے بدلوانا لنچ باکس رکھنا اور ان کے سارے کام دیکھنا پھر شام کو پڑھائی وغیرہ کروانا سب ہی کچھ دیکھنا پھر تم لوگوں کو و تمہارے دادا دادی کو سب کو ہی اچھے اچھے کھانوں کا شوق تھا وہ کھانے میں تیار کرتی تھی۔

ہمیشہ آمدنی بڑھانے اپنے بچوں کو اچھی طرح رکھنے کے لئے میں نے سروس کی اور خاندان میں سب جگہ عزت پائی مجھے بہو سے بھی یہی امیدیں

ہیں۔فیضان اپنی امی کو ٹک ٹکی باندھے غور سے دیکھتا رہا دیکھتا ہی رہا اور دل میں اپنی ماں کی عظمت بڑھاتا رہا۔

فائزہ کے آنے کا ٹائم اُوور ہو گیا تھا آخر میں فکر ہونے لگی کہ ابھی تک فائزہ گھر پر کیوں نہیں آئی۔ایک دم فون کی بیل بجی فیضان نے فون اٹھایا فائزہ کا فون تھا فائزہ کہہ رہی تھی فیضان میں اپنی امی کے گھر پر آ گئی ہوں یہاں کلاس فیلو جمع ہیں۔ لڑکے لڑکیاں سارے دوست مٹھائی کی زور و شور سے فرمائش کر رہے ہیں تم جلدی سے مٹھائی ناشتے کا سامان وڈس پوزل گلاس و پلیٹس لیکر آ جاؤ۔اور امی سے کہہ دینا کہ میں آج گھر نہیں آؤں گی مجھ کو دو ہفتے لگ جائیں گے۔

فیضان کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا وہ پھر سے ریسیور اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا فیضان نے جب اپنی امی کو دیکھا کہ وہ فون کی بات سننے کے لئے بے تاب ہیں تو اس نے کہا کہ امی فائزہ کا فون ہے وہ اپنے گھر پہنچ گئی ہے اس کے پاس ہونے کی خوشیاں منانے کے لئے وہاں سب لوگ جمع ہیں۔مجھ سے مٹھائیاں ناشتے کا سامان وغیرہ وغیرہ منگوا رہی ہے ساتھ میں یہ بھی کہہ رہی ہے کہ امی سے کہنا کہ میں ایک دو ہفتے کے بعد آؤں گی۔

گھر میں فرخ آ چکا تھا اس کی بہن اپنی بھاوج کے پاس ہونے کی خوشی میں اپنے شوہر کے ساتھ مٹھائیاں پھل اور ہار پھول لیکر آئی ہوئی بیٹھی تھی۔فرخ اور اس کا چھوٹا بھائی گڈو بھی اپنی بھلی بری بھاوج کو معاف کر کے ہار پھول پہنانے کے لئے بے چین تھے مگر امی کو ایک ٹھکا لگا جو بڑھتا ہی چلا گیا بیٹی نے پانی پلایا فیضان نے پیٹھ پر ہاتھ پھیرا لیکن ان کی سانس کا زور

تیز ہو گیا اور بڑھتا ہی گیا اتنے میں فیضان کے پاپا عمران احمد آگئے اور گھبرا کر
کہتے رہے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ بھئی جلدی کرو ڈاکٹر کو لیکر آؤ اتنے میں ریحانہ بیگم
نے کوشش کر کے اپنی آنکھیں پوری کھولیں نظر بھر کر شوہر کی جانب دیکھا اور وہ
اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

افسوس کا سمندر

آج B.S.C. Final کے رزلٹ آ گیا ہے۔ فرزانہ کو مبارک باد دینے کے لئے اور خوش گپیاں کرنے کے لئے گھر میں اس کے کلاس فیلو جمع ہیں۔ زور وشور ہو رہا ہے سب لوگ بے چینی سے فرزانہ کا انتظار کر رہے ہیں لیکن فرزانہ ایک کمرے میں بند ہو کر رو رہی ہے۔ زار وقطار آنسوؤں کی لڑیاں بندھ رہی ہیں کبھی ہاتھ پیر پٹکتی ہے تو کبھی آنسوؤں کی دھاروں کو دوپٹے سے پوچھتی ہے۔

رضوانہ کی چھوٹی بہن فرح کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی ہے "باجی دروازہ کھولو دیکھو آپ کو مبارک باد دینے کے لئے آپ کے کتنے دوست آئے ہیں لڑکے لڑکیاں سب ہیں ساتھ میں مٹھائی اور ہار پھول لائیں ہیں۔ یہ سنکر رضوانہ اپنے بالوں کو نوچنے لگی اور کہنے لگی کہ ان سے کہدو کہ وہ ابھی کسی سے نہیں ملیں گی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے رضوانہ دل میں سوچ رہی تھی کہ ہائے میرے لئے اتنے لوگ جمع ہیں لیکن ایک وہ ہی نہیں جس نے مجھ کو اس مقام تک پہنچایا مجھ پر اپنی محنت کا روپیہ پیسہ خرچ کر کے مجھ کو تین سال تک پڑھایا۔ پرائیویٹ کالج کی فیس ٹیوشن کی فیس کتابوں کا پیوں وغیرہ کا سب خرچ اٹھایا اور وہ مجھ کو گھر کے کام کرنے سے بچانے کے لئے اپنی امّی سے طرح طرح سے دلیل و حجت کر لیا کرتا تھا پڑھائی کی غرض سے مجھ کو اکثر میکے چھوڑ دیا کرتا تھا۔ آئے دن چھوٹی چھوٹی قربانیاں کرتا رہتا

تھا اور کہتا تھا کہ تم پڑھائی پوری کرلو پھر زندگی پُر بہار و خوش حال ہوگی۔

ہم دونوں مل کر اپنی زندگی کو خوبصورتی سے سجائیں گے گھومیں گے پھریں گے خوب مستی ہوگی۔ اپنے گھر میں ننھے منے مہمان کا انتظار کریں گے اپنے آنگن میں مہکتا ہوا گلاب ہوگا چھم چھم کرتا ہوا منا گھومے گا کبھی دادی بلائیں گی کبھی دادا ہاتھ بڑھائیں گے۔ اپنے گھر کی سیٹنگ اپنے ٹائم ٹیبل اور اپنی نوکرانی سب سیٹ کر یہاں لذیذ کھانے طرح طرح کی ڈشیں تیار کیا کرنا۔ اگر سروس کروتو پہلے گھر کے کاموں کی طرف توجہ دینا۔ پھر اپنی زندگی گنگنائے گی ہر طرف شوخی و شرارت ہوگی مسرت کی لہریں ہمیں تروتازہ گلاب کی مانند رکھیں گی اپنے دل کو خوش رکھ کر زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسائل اطمینان سے حل کریں گے ہمارا چھوٹا سا خوبصورت پریوار ہوگا منے کے دو چاچا ہونگے پھوپھی بھی اپنی سسرال سے منے سے ملنے آتی رہیں گی وغیرہ وغیرہ۔

رضوانہ سوچ رہی تھی کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا !! اس شخص کو اپنے عارضی دوستوں کے خاطر چھوڑ دیا اس کے سارے سپنے چکنا چور کردیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑ کر اپنے شوہر کو ناراض کردیا نوبت یہ آگئی کہ میں طلاق مانگنے لگی۔ مجھ کو امی نے سمجھایا نہ ابو نے وہ میرے کہنے میں آگئے اور جو جو میں کہتی گئی وہ ویسا ہی کرتے گئے۔

میں نے شوہر کی نافرمانی کی میں نے شوہر کا کہنا نہ مانا لمبے لمبے گیپ میں بھی میں اس کے ساتھ گھر نہ جاتی تھی اگر شوہر مجھ سے گھر چلنے کے لئے کہتا تھا تو کیا برا تھا وہ مجھ سے پیار کرتا تھا اسی لئے تو، لیکن میں اس پر جھنجھلاتی رہی۔ ہائے صد

افسوس میں نے اس کی قدر نہ جانی بلکہ میں نے اس سے کہدیا کہ تم مجھ سے بات مت کرنا۔ اب میں بھی تم سے بات نہیں کرونگی۔ اب تم میرے گھر پر مت آنا آخر وہ کہاں تک برداشت کرتا!۔

ایک دن جب میں اپنے کپڑے لینے اس کے گھر گئی اس وقت بھی میں نے اس سے سلام ودعا کچھ نہیں کیا بلکہ اپنے غصے کا اظہار کرتی رہی اس کے پوچھنے پر کہ اب تم کب آؤگی یہ کہہ دیا کہ میں تم سے بات نہیں کر رہی وہ خاموش ہوگیا دن گذر گئے پھر وہ میرے گھر نہ آیا۔

امتحان ختم ہوگئے لیکن میں گھر نہیں گئی اور اپنے دوستوں میں مست و بے پرواہ رہی مجھے اس کے نہ آنے کا احساس بھی نہ ہوتا گھومنا پھرنا تفریح کرنا سہیلیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا لگا رہتا لڑکے لڑکیاں مل کر پروگرام بنالیتے اور خوب تفریح کرتے رہتے۔

اب رضوان نے آنا اور روپئے اور پیسے دینا بھی چھوڑ دیا تھا میں نے ابو کو رضوان کے پاس پہنچا کر طلاق لینے کا اِرادہ ظاہر کردیا اور بار بار میں کہلواتی رہی کہ مجھے مہر بھی چاہئے اور طلاق بھی۔ رضوان طلاق دینا نہیں چاہتا تھا لیکن بار بار سنتے سنتے وہ عاجز آچکا تھا۔ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ سوچتا کہ آخر میں نے کیا غلط کیا ہے مجھ سے کہاں غلطی ہوئی تو اس کو کچھ بھی غلط نہیں لگتا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جب رضوانہ فائنل امتحان پاس کریگی تو مجھ سے طلاق لے لیگی اس کا دل غم کے سمندر میں ڈوب گیا اس کے ارمان چکنا چور ہوگئے آنسو خشک ہوگئے۔

آخر وہ دن بھی آگیا کہ شرعی عدالت قضیات میں رضوانہ اس کی امّی اور

ابّو رضوان کا انتظار کر رہے تھے رضوان کو بھی جانا پڑا۔رضوان کا دل اداس تھا اس کی امّی ایک سال پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں اب بیوی بھی ساتھ چھوڑ رہی ہے اپنی ضد اور ہٹ پر تلی ہوئی ہے رضوانہ خوش تھی اس کے ابو کہہ رہے تھے ''پورا مہر چاہئے آدھا نہیں قسطوں میں بھی نہیں آج ہی پورا مہر دے دو ورنہ ہم سرکاری عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں گے !!

طلاق ہو چکی رضوان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے آج فرزانہ کو اپنی تعلیم کے باوجود اپنا دل دماغ خالی خالی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اس کی سمجھ میں اب یہ آگیا تھا کہ یہ سارے دوست وقت کے ساتھ چھوٹ جائیں گے سب کے راستے الگ الگ ہونگے اپنی اپنی زندگی ہوگی اور میں اکیلی رہ جاؤں گی میرا کوئی اپنا نہ ہوگا جس کے سائے میں، میں محفوظ رہ سکوں۔

ہائے میرے ابو اور میری امی نے مجھ کو کیوں نہیں سمجھایا میں بہک گئی تھی لیکن ان کو کیا ہوا تھا ؟ یہ سب کیوں ہوا میں نے ایک بے گناہ انسان کو کیوں پریشان کیا؟ میں اپنے آپ کو کیسے معاف کروں گی انتظار کرتے کرتے سب لوگ جا چکے تھے۔اب رضوانہ کمرے سے باہر نکل آئی اور ہار مسل کر پھینک دیئے مٹھائی کے ڈبے آنگن میں سنا دیئے اور اپنی امی سے کہنے لگی ''امی آج میں نے .B.S.C تو پاس کر لیا لیکن شرافت و محبت کا پیکر و ذمہ داری سے بھر پور بہترین محافظ کھو دیا ہے !! آپ نے اور ابو نے مجھ کو کیوں نہیں سمجھایا ؟ آپ دونوں کی عقل کہاں چلی گئی تھی؟ میرا دل ڈوبا جارہا ہے اب اب تو افسوس کے سمندر میں ہی میرا ٹھکانا ہے'' !!

☆☆☆

لڑکے والے

بھابی بیگم قریب چھ ماہ سے اپنے پیارے فرزند ممتاز کے لئے ایک خوبصورت وحسین لڑکی کا انتخاب کرنے میں مصروف تھیں وہ چاہتی تھیں کہ جلد ہی بہو گھر میں آجائے جب بہو گھونگٹ ڈال کر بجی دھجی سسرال والی لڑکیوں و دولہا کی بہنوں کے ساتھ داخل ہوگی وہ وقت کتنا حسین ومبارک ہوگا بہو کے آنے سے گھر خیر وبرکت نور وروشنی سے منور ہوجائے گا گھر میں بہو چھم چھم کرتی ہوئی چلے گی پھرے گی سنگھار کرکے سج دھج کے بیٹھے گی آنے والوں سے اچھی طرح پیش آئے گی اخلاق ومحبت پاکر سب لوگ باغ باغ ہوجائیں گے۔

جب وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کرکے سب کو کھلائے گی اور گھر کے کام وغیرہ میں دلچسپی لے گی نئی نئی ڈشیں بنائے گی اس وقت گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی قمر، وریئس، وآمنہ، اوران کے والد کتنے خوش ہونگے خدارا وہ دن جلد ہی آجائے اچھی بہو کا ارمان تو سب ہی لوگ کرتے ہی ہیں لڑکے والے بہو میں ہرایک گن دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے آپ کو بھی ترازو میں تولتے رہنا ایک عقلندی ہے ایک دن فہمیدہ بیگم کی چھوٹی نند فریدہ نے اپنی بڑی بھاوج یعنی ممتاز کی امّی سے کہا بھابھی بیگم ممتاز کے لئے لڑکی تلاش کرتے کرتے بہت روز ہوگئے وقت اور کافی پیسہ خرچ ہوچکا ہے آپ کو کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آرہی ہے میری اب یہ رائے ہے کہ آپ کوئی

محفل یا شادی میں لڑکی دیکھ لیں لڑکے کو بھی دکھادیں اس سے بات چیت کر کے وہیں اس کے گھر والوں سے مل لیں اگر آپ مطمئن ہو جائیں تو پھر گھر پر جا کر ذکر کر دیجئے گا۔

یہ بات تو ٹھیک تھی لیکن فہمیدہ بیگم کو یہ بات پسند نہیں آئی تنک کر بولیں واہ میں کیوں اپنا لڑکا اتنی آسانی سے دکھادوں رہا لڑکیوں کا سوال تو وہ تو عادی ہوتی ہی ہیں ان کو دیکھنے والے دس ہوتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ گھر پر جا کر دو تین بار لڑکی دیکھوں تب اس کے رنگ ڈھنگ کا اندازہ ہوتا ہے طور طریقے وغیرہ بھی تو دیکھنا پڑتا ہے گھر کے حالات کس درجے کے ہیں وغیرہ۔

فہمیدہ بیگم کی نند تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بولیں۔ بھابی بیگم ایک لڑکی میں ہر ایک خوبی تو نہیں ہوتی ساتوں باتیں کسی میں نہیں ہوتیں۔ میں کہتی ہوں سات خوبیوں میں سے اگر کسی میں چار خوبیاں بھی ہوں تو لڑکی پسند کر لینی چاہئے۔ فہمیدہ بیگم ذرا تیز ہو کر بولیں اے لو پھوپی تو ابھی سے گھبرا گئیں۔ پھوپیاں تو اپنے بھتیجوں کے لئے حسین ترین دلہن لانے کی کوشش کرتی ہیں ایک تم ہو کہ ابھی سے ہمت ہار ے جا رہی ہو۔

سات خوبیاں نہیں تو چھ تو ہونا ہی چاہئے تمہارا بھتیجہ کونسی زیادہ عمر کا ہے ایم اے پاس کرتے ہی اس نے سروس کر لی اگر اس کو بزنس کا شوق ہوتا تو وہ بزنس کر لیتا۔ چھوٹی چھوٹی دوکانوں سے لوگ ہزاروں کما رہے ہیں لیکن نہ اس کو پیسہ کی ہوس ہے نہ ہی دوکانداری پسند ہے۔ وہ تو عزت سے کرسی پر بیٹھ کر قلم چلا کر آفس میں نوکری کرنا چاہتا ہے چاہے وہ کلرک شپ ہی کیوں نہ ہو اگر بزنس کرنا ہوتا تو

ہمارے گھر کی ہی دو دکانیں تھیں جو کرائے سے دے دیں۔

لیکن ہمارا بیٹا پڑھ لکھ کر آفس میں سروس کرنا ہی پسند کرتا ہے اس کو پیسے کی ہوس نہیں ہے اس کا کہنا ہے کہ کم ہی ہو لیکن آرام سے آفس میں بیٹھ کر تنخواہ ملتی رہے بزنس میں دوڑ دھوپ و محنت کرنا پڑتا ہے۔ پیسے کے پیچھے کون بھاگے جو آرام سے مل جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

تم تو جانتی ہو کہ تمہارا بھتیجہ حسین لائق اور کم عمر ہے لوگوں نے کہہ سن کر ایک لڑکی پسند کروادی تو ہم نے منگنی کرلی دھوم دھام سے ممتاز کی منگنی ہوئی لڑکی والوں نے ہال بک کروایا زوردار کھانے وغیرہ پکوائے زوردار سواگت ہوا ہم نے بھی ارمانوں سے جوڑے چوڑیاں سینڈلیں و زیور ہار پھول مٹھائیاں وغیرہ سب کچھ کیا منگنی بہت اچھی ہوئی اور تم سب لوگ خوش تھے اور مبارک باد دے رہے تھے۔

بعد میں پتہ چلا کہ لڑکی عمر کی بہت ہے دل بیٹھ گیا کئی لوگوں نے اور خاص طور پر آپا نے بہت سمجھایا کہ لڑکی دبلی پتلی ہے عمر پتہ نہیں چل رہی ہے شادی کر ڈالو مگر فریدہ کیا بتاؤں میرا دل نہیں بھرا بے چینی ہوئی تم جانتی ہو کہ کس خوبصورتی سے منگنی ہوئی لیکن عمر کا سنکر دل بیٹھ گیا پھر لڑکی والوں کے مالی حالات بھی کچھ خاص نہیں تھے اسی لئے میں نے یہ منگنی بہت جلدی توڑ دی اگر چہ لڑکی والے کسی طرح منگنی توڑنے کے لئے راضی نہ تھے لیکن اب تمہیں بتاؤ کہ ان لوگوں کی چاہت دیکھیں کہ اپنے لڑکے کی جوڑی؟

یہ سب باتیں سن کر فریدہ کو بہت دکھ ہوا۔ اس کی بھی یہی مرضی تھی کہ منگنی نہ توڑی جائے لڑکی پر اچھا آثر نہیں پڑتا آخر ہم کو ہمارے سماج میں دوسروں کا بھی تو

خیال رکھنا چاہئے ۔بیچاری پڑھی لکھی قابل لڑکی ہے درمیانی صورت کام میں بھی ہوشیار لیکن بھابی بیگم کو نہ جانے کیوں یہ خیال نہیں ہے کہ لڑکی پر اس کا کیا اثر ہوگا؟

بھابی بیگم کہہ رہی تھیں منگنی ہوئی اس میں لڑکی والوں نے زوردار کھانا کیا کافی پیسہ خرچ کیا تو کیا ہوا ہم بھی تو بہت سی مٹھائیاں پھل اور دنیا بھر کے لوازمات وغیرہ وغیرہ لیکر گئے تھے ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

ہماری طرف کا سونے کا سیٹ دلہن کا جوڑا سینڈلیں چوڑیاں سب ہی چیزیں واپس آ گئی ہیں۔لڑکے کو جو انہوں نے دیا تھا ہم نے وہ سب واپس کر دیا ہے فہمیدہ بیگم اپنی نند سے آگے کہتی رہیں ”ارے فریدہ تم کو کیوں اتنا افسوس ہے تم اتنا غم کیوں کر رہی ہو۔ ہمارا اس میں کیا بگڑا ہے جو دلہن کے لئے گیا تھا سب واپس ہو ہی گیا ہے منگنیاں ٹوٹ ہی جاتی ہیں لڑکیاں اور بھی ہیں آخر ہم ”لڑکے والے“ ہیں۔ جب تک من پسند لڑکی نہ ملے گی تب تک لڑکیاں دیکھتے ہی رہیں گے۔

فریدہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی نہ جانے کتنے سوال اس کے ذہن میں آ رہے تھے جو درد بن کر اس کے دل و دماغ میں گھوم رہے تھے !!!

☆☆
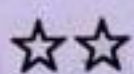
اِتفاق

بارش کا خوبصورت موسم تھا برسات کی رِم جھم پھواریں پڑ رہی تھیں۔ شجر ہجر سب ترو تازہ ہو گئے تھے۔ پیڑ پودے کوئی گہرے ہرے کوئی دھانی رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ بیشمار طرح طرح کے پھول اپنے حسن و خوبصورتی سے من کو لبھا رہے تھے۔ بادل برس چکا تھا سب کی پیاس بجھ گئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں من کو موہ رہی تھی جس طرف نظر جاتی اِک خوشگوار سماں تھا پرند و چرند سب پر ہی بہار کا اثر تھا۔

اس حسین موسم میں ارشد اور اُن کی دُلہن اپنی شادی کے قریب چھ ماہ بعد گھومنے و تفریح کرنے کی غرض سے ٹرین سے بمبئی روانہ ہوئے تھے۔ دن کے بارہ بجے کا ٹائم تھا۔ نئے نئے دولھا دلہن اپنے والدین سے اِجازت لیکر خوشی خوشی اپنے گھر سے تفریح کے لئے روانہ ہو گئے۔ ارشد کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جو چھ دنوں کے کپڑوں کے لئے کافی تھا۔ ارشد کی دُلہن نے پیلے رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی جس کے پلّو میں جال بُنا ہوا تھا اور رنگین تاگے کے گچھے لٹک رہے تھے۔

ٹرین آئی۔ شہناز ٹرین میں چڑھ گئی۔ سامنے ہی ایک خوبصورت کم عمر نوجوان اپنا سوٹ کیس بچاتا ہوا سیٹ پر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ شہناز کی ساڑی کے پلو کے جال میں اُس کے کوٹ کا بٹن اُلجھ گیا۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہو گیا۔ اُس نوجوان نے شہناز کی جانب کچھ مُسکراتے ہوئے دیکھا۔ شہناز نے اُس کی جانب کچھ کشمکش کے انداز میں دیکھا ایک منٹ وہ سوچتی رہی کہ یہ شخص اپنے اُلجھے ہوئے بٹن کو میری

ساڑی کے پلو کے جال سے نکال لے! اُدھر وہ نوجوان شخص اس سوچ میں تھا کہ میں ان کی ساڑی کو کیسے ہاتھ لگاؤں! آخر شہناز نے جلد ہی اپنی ساڑی کے پلو میں پھنسے ہوئے بٹن کو نکال لیا اور مسکراتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا میں شادی شدہ ہوں۔ اس پر وہ شخص جو کشمکش میں مبتلا تھا ہنس کر بولا "جی اتفاق سے میں بھی شادی شدہ ہوں۔ وہ دیکھئے سامنے والی سیٹ پر میری دھرم پتنی یہ منظر دیکھ رہی ہیں۔

شہناز نے اپنے لپ اسٹک لگے ہوئے خوبصورت ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا یہ دیکھئے یہ میرے مسٹر ہیں جو میری کشمکش کو سمجھ کر مسکرا رہے ہیں۔

دونوں پیئر آمنے سامنے کی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور دونوں بیویوں نے شکر ادا کیا کہ ایک **Love Story** شروع ہونے سے بچ گئی۔

شہناز کے سامنے نیلم بیٹھی ہوئی تھی جو خوبصورت نیلے رنگ کی جارجٹ کی ساڑی میں ملبوس ، ماتھے پر لال رنگ کی بڑی بندی لگائے ہوئے تھی۔ گلے میں سونے کا بہت حسین منگل سوتر کانوں میں بالیاں سے پہنے ہوئے تھی۔

مخاطب ہو کر شہناز نے پوچھا بہن جی، آپ کہاں جائیں گی۔ نیلم نے بڑی مٹھاس کے ساتھ جواب دیا۔ ابھی ابھی ہماری شادی ہوئی ہے ہم دونوں بمبئی گھومنے کے لئے جا رہے ہیں۔ شہناز مسکراتے ہوئے بولی اتفاق سے ہم بھی بمبئی ہی گھومنے جا رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے دونوں نے ہاتھ ملا کر دوستی کا اظہار کیا۔ اور یہ دوستی نے سفر کو خوبصورت ترین بنا دیا۔ دونوں کے مسٹر بھی آپس میں ہنستے بولتے کھاتے پیتے باتیں کرتے رہے دونوں پیئر ایک ہی مقام سے چڑھے ایک ہی مقام پر دونوں کا سفر ختم ہونا تھا۔ اور اتفاق کی یہ دوستی اَمر ہوگئی ....

☆☆

حق کا استعمال

حفیظ میاں کے صاحبزادے شیراز احمد اپنے والد کے لئے ٹفن میں مزے مزے کے کھانے لیکر آتے اور کہتے ابّا یہ کھانا آپ کی چھوٹی بہو نے تیار کیا ہے۔ کھانا کھاتے وقت مجھ کو آپ کی یاد آجاتی ہے۔ نوالا ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے دل میں خیال آتا ہے کہ پتہ نہیں ابّا نے کس طرح کا کھانا کھایا ہوگا۔ ابّا کو ہوٹل کا کھانا پسند نہیں آتا ہوگا! حفیظ میاں ایک سرد آہ بھرتے ہوئے شیراز کے ہاتھ سے ٹفن لے لیتے اور کھانا کھانا شروع کردیتے۔ گھر کا کھانا صفائی سے بنا ہوا لذیذ و مزے دار ہوتا ہے۔ جو دل کو لگتا کبھی حفیظ میاں کے بڑے صاحبزادے لقمان ٹفن میں ابّا کے لئے کھانا لیکر آتے اور بتاتے کہ ابا یہ آپ کی بڑی بہو کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا کھانا ہے۔ والد محترم اچھے کھانوں کے عادی تھے۔ خوش ہوکر کھانا کھاتے اور اپنی بدنصیبی پہ جو اپنے ہاتھ سے پیدا کی تھی افسوس کرتے۔ بچوں کی خیریت پوچھتے۔ کبھی ان کی بیماری کا پتہ چلتا تو فکر کرتے رہتے۔ کبھی کبھی بچے اپنے دادا سے ملنے اپنے اپنے پاپا کے ساتھ آتے رہتے۔ بچوں کے جاتے وقت دادا بہت دُکھی ہوتے اُن کو پیار کرتے۔ بچے اپنے دادا سے پوچھتے دادا آپ گھر کیوں نہیں آتے۔ گھر چلئے نا۔ دادی آپ کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ دادا افسردہ ہوکر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہتے۔ حفیظ میاں کو اپنے گھر کی بچوں کی اور بیٹی کی بہت یاد آتی دن بھر یاد میں ڈوبے رہتے۔ کبھی کبھی اِتنا روتے اتنا روتے کہ داڑھی مونچھیں بھیگ جاتیں اور آنسو نہ تھمتے۔ ایسا

کیوں ہوتا تھا؟ اس لئے کہ حفیظ میاں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک ہی شہر میں دوسرے گھر میں اکیلے رہنا پڑ رہا تھا۔ حفیظ میاں کچھ دِنوں سے گھر میں اپنی بیوی سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف کرنے لگے تھے۔ اور ذرا ذرا سی بات پر جھگڑنے لگتے تھے۔

ایک دن معمولی سی بات پر غصّے میں آکر حفیظ میاں نے اپنی عزیز بیوی کو طلاق دے دی۔

یوں تو زندگی خوشگوار گزری تھی گھر میں ہمیشہ دوستی ومحبت کا ماحول بنا رہا تھا میاں بیوی دونوں ساتھ ساتھ کہیں بھی جاتے آتے باتیں کرتے اور ہنستے بولتے رہتے تھے لیکن یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا!۔

حفیظ میاں کے دو بیٹے اور ایک بیٹی جوان ہوئے۔ دو بیٹوں کی بڑی دھوم دھام سے شادیاں ہو چکی تھیں۔ عزیز واقارب شہر کے تمام عمائد شریک ہوئے تھے۔ دونوں بیٹوں کے دو دو بچے ہو گئے تھے۔ ایک بیٹی جو B.com Final کر چکی تھی جو شادی کے لئے رہ گئی تھی۔

حفیظ میاں کی بیٹی کے دل پر ابّا کا یہ عمل حادثہ کی طرح گزرا۔ وہ گھر میں روتی رہتی۔ بڑا سارا گھر آرام وآسائش کے تمام سامان مہیا تھے۔ لیکن یہ سب کچھ ناظمہ بیٹی کو بالکل پھیکا لگنے لگا اُس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے زندگی کی ساری خوشیاں ختم ہو گئی ہیں۔

حفیظ میاں کے دونوں بیٹے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ تھے۔ بڑے بیٹے کھیتی دیکھتے۔ چھوٹے بینک میں مینیجر تھے۔ حفیظ میاں نگر نگم میں ٹیکس آفیسر تھے جو ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اچھے خاصے حالات خوشگوار ماحول میں ہنسی خوشی وقت گزرتا تھا۔

ہر وقت میاں بیوی ساتھ ساتھ کہیں بھی جاتے آتے اور ہنستے بولتے رہے

تھے لیکن ایک ہوا ایسی چلی کہ طلاق کا چلن عام ہو گیا۔ نئی نئی عمر کے لڑکے بیویوں کو طلاق دینے لگے۔ کئی جگہ بیویاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق لینے لگیں۔ زور و شور سے یہ خبریں عام ہونے لگیں۔

حفیظ میاں جو نہایت سمجھدار اور بیوی سے محبت کرنے والے شوہر تھے انھوں نے بھی یہ اثر قبول کر لیا اور غصہ میں آ کر اپنا حق استعمال کر لیا اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔

طلاق ایسی چیز تو نہیں کہ دے کر واپس لے لی جائے۔ جس طرح بندوق سے نکلی ہوئی گولی واپس نہیں آ سکتی اسی طرح زبان سے نکلا ہوا لفظ بھی واپس نہیں آ سکتا۔ بس اتنا ہو سکتا ہے کہ معافی کے لئے جھکنا پڑتا ہے وہ بھی اگر قانون میں کوئی گنجائش ہو تو ورنہ ہاتھ ملتے رہیئے ''حق کا استعمال'' تو کر ہی لیا!!

حفیظ میاں اپنی زمین و جائداد کے حصے کر چکے تھے۔ وہ مکان جس میں سب رہ رہے تھے حفیظ میاں نے اپنے دونوں بیٹوں کے نام کر دیا تھا۔ کھیتی میں سے کچھ زمین بیوی و بیٹی کے نام بھی ہو چکی تھی۔ ناظمہ بیٹی کا رشتہ ایک اچھے معزز گھرانے میں طے ہو گیا تھا۔ شادی کی ساری تیاریاں مکمل تھیں۔ بس شادی کی تاریخ لینے کی دیر تھی۔ طلاق کا یہ واقعہ بڑا ہی تلخ و عجیب معلوم ہوا۔

اس واقعہ کو دو ماہ گزر چکے تھے۔ قاضی صاحب سے حفیظ میاں نے جب مسئلہ معلوم کیا تو مسئلے کی رو سے طلاق ہو چکی تھی۔ لیکن قوانین میں صلح کی کچھ گنجائش تھی۔ حفیظ میاں کی صاحبزادی ناظمہ رو رو کر اپنے ابا سے کہتی ''ابا آپ نے یہ کیا کیا ہماری پیاری امّی کو اتنی بڑی سزا کیوں دے دے اور وہ بھی اس آخری عمر میں چھوٹی سی بات پر؟ اُس نے رو کر کہا ابا سچ مانئے مجھے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا زندگی پھیکی

پھیکی ہوگی ہے امّی اُداس رہنے لگیں ہیں آپ ہم سے اتنے دور ہو گئے۔اب میرا دل زندہ رہنے کونہیں چاہتا۔

حفیظ میاں نے غم وافسوس کے مارے آنکھیں جھکا لیں اور آنسو پوچھتے ہوئے کہنے لگے ”بیٹی ناظمہ میرے سر پر شیطان سوار ہوگیا تھا۔ میں تجھے کس طرح بتلاؤں میں رات بھر سوتا نہیں ہوں روتے روتے رات گزرتی ہے۔ وہ تو یہ اچھا ہوا کہ تمہاری دادی یعنی میری امّاں نے بہت سوجھ بوجھ سے کام لے لیا کہ بہو کر گھر سے نہ جانے دیا۔اُدھر بیٹے بھی اپنی ماں کے لئے کھڑے ہو گئے ”ابا آپ دوسرے گھر میں رہ لینا ہم لوگ تو اپنی پیاری امّی کو اپنے گھر سے دور کرہی نہیں سکتے وہ تو ہماری روح رواں ہیں امّی نے ہم کو پال پوس کر پڑھا لکھا کر شادیاں کر کے اس مقام تک پہونچادیا۔ ہمارا خوشحال گھر ہماری امّی کے بغیر کیسا ہو جائے گا یہ سوچ کر ہمارا دل کانپ اُٹھتا ہے۔

حفیظ میاں اپنی بیٹی ناظمہ سے کہہ رہے تھے۔بیٹی وہ تمہاری ماں بہت اعلیٰ خاندانی خاتون ہیں۔ میرے دماغ میں ہی شیطان نے کیڑے چھوڑ دیئے تھے۔آج کل طلاق لینے ودینے کی جوانوں میں جو ہوا دچلی میرے دماغ میں بھی اتفاق سے یہ بات پیدا ہوگئی۔اور میں نے اپنے ”حق کا استعمال“ کرلیا۔ اب میں شرعی عدالت جا کر معلومات کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔

میں مفتی صاحب سے درخواست کرونگا خدا میرے لئے کوئی راستہ نکالے کوئی قانون کوئی نکتہ جو میرے لئے صلح کا باعث بن جائے۔ میں اپنی وفادار بیوی کے بغیر مر جاؤں گا۔اور میری زندگی بھی موت سے بدتر ہوگی!!

☆☆☆

کوٹھی تیار ہوئی

ٹھیک ایک سال بعد مسرور احمد کی کوٹھی بن کر تیار ہوگئی ۔اس کوٹھی پر خاص توجہ اور لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا تھا نقشہ بھی ایک بڑے انجینئر نے تیار کیا تھا جو دوبئ میں رہ کر آئے تھے دومنزلہ گول ڈیزائن والی یہ کوٹھی ایک الگ ہی طرز کی عمارت تھی ۔

کار کے لئے کشادہ جگہ خوبصورت پارکنگ تین سائڈ پر حسین ترین کیاریاں بنی ہوئی تھیں جس میں ہمہ اقسام کے پھول و پودے گلاب و موگرے، چنبیلی، جوہی اور مختلف پھولوں کے درخت تھے جس میں کئی کلر کے گہرے گہرے خوشنما پھول لگے ہوئے تھے عمارت کے نیچے ہال کو خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔فرش پر وہ چمک دمک کے اوپر کی منزل میں بھی گول طریقے کا ہال آس پاس کمرے اور لیٹ باتھ وغیرہ کچھ اندر کی جانب تھے جگہ جگہ قیمتی واشبین آئینے ۔نئ نئ سینریز لگی ہوئی تھیں۔اوپر چڑھنے کے لئے لہراتا ہوا خوبصورت سنہری جالیوں والا زینہ جو سونے کا ہی معلوم ہوتا تھا۔اپنی کمر میں بل دیتا ہوا گھوم گیا تھا ۔نئ کوٹھی اپنی خوبصورتی رنگ وروپ لیکر تیار ہوگئی تو مسرور احمد صاحب نے اس نئے گھر کا جشن منایا۔اس طرح کوٹھی کو سجایا گیا جیسے کسی دلہن کا سنگھار کیا جاتا ہے۔

صوفے کے جھولے چاندی کی طرح موٹی موٹی زنجیروں وکڑیوں میں لگائے گئے ۔بہترین وقیمتی سامان وڈیکوریشن پیس گملے و پھول وغیرہ وغیرہ ہر طرف

نئی نئی چیزیں نظر نظر آ رہی تھیں ۔ ٹیوب لائٹیں، بلب و بیشمار برقی قمقمے روشنی بکھیر رہے تھے ۔کوٹھی کے اندر اور باہر سے روشنی کا مرکز نظر آ رہی تھی۔ اس کوٹھی کے تیار ہونے میں کئی مزدوروں نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا یہ مزدور ہیں جو بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہوتا ۔ جو دن بھر کام کر کے اپنا پسینہ بہا کر روکھی سوکھی کھا کر پھر کام میں مصروف ہو جاتے ہیں کوٹھی جب تیار ہو جاتی ہے تو باہر ہو جاتے ہیں یہی عام بات ہے۔

کوٹھی میں جشن ہونے والے پروگرام کی سب مزدوروں کو خبر مل گئی تھی ۔ سب نے مل کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ سب اکٹھا ہو کر کوٹھی کی روشنی وسجاوٹ کو دیکھنے ضرور جائیں گے ۔ رات کے نو بجے تک سارے مہمان آ چکے تھے ۔اوپر کے ہال میں سے خواتین و دوشیزاؤں کے نقرئی قہقہے گونج رہے تھے اور لذیذ ترین کھانوں کی خوشبو، ہَوا میں دور تک اُڑ رہی تھی ۔ برسات کی حسین پھواریں پڑ کر تھم گئی تھیں کھانے پینے کے دَور چل رہے تھے۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے پہرے داروں نے دیکھا کہ بیس پچیس لوگ گیٹ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور کوٹھی کی روشنیاں وسجاوٹ غور سے دیکھ رہے ہیں نیچے کے ہال پر نظر ڈالتے ہیں کبھی اوپر کے ہال سے کھڑکیوں سے آئی ہوئی روشنیاں دیکھتے ہیں ان کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی وہ سوچ رہے تھے کہ ہم سب نے مل کر یہ حسین کوٹھی بنائی ہے جب تک ہم زندہ رہیں گے لوگوں کو بتلاتے رہیں گے کہ یہ کوٹھی ہمارے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔

مسرور احمد صاحب خود بھی انجینئر تھے ان کے دو بیٹے دو بہوئیں تھی دو بیٹیاں

اور دو داماد تھے ۔ ان سب لوگوں کا حیدر آباد میں ہی قیام تھا۔ مزدور مستری و کاریگروں کا یہ قافلہ کوٹھی کے گیٹ پر جا کر کھڑا ہو گیا تب گیٹ کیپر ہری نے ان کو روکا ان کو شک ہوا کہ اس قسم کے لوگ یہاں کیا لینے دینے آئے ہیں ۔ اس نے ان لوگوں سے کہا ''تم لوگ اندر نہیں جا سکتے'' ان لوگوں نے جواب دیا کہ ''ہم لوگ اندر جانے کے لئے نہیں آئے ہیں باہر سے ہی کوٹھی کی رونق و سجاوٹ کو دیکھنے اور صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ تم جا کر مسرور صاحب کو بلا لاؤ ہم لوگ صاحب کو نئی کوٹھی کی مبارک باد دیں گے۔

پہلے تو گیٹ کیپر کو کچھ شک ہوا پھر کچھ یقین کر کے وہ ایک ملازم کو گیٹ پر کھڑا کر کے صاحب کے پاس گیا اور بتلایا کہ بیس پچیس لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں ۔ مسرور صاحب دوستوں کو چھوڑ کر دوسری منزل سے اُتر کر نیچے آئے ۔ کچھ مفکر ہوئے کچھ گھبراہٹ ہوئی کہ وہ کون لوگ ہیں ۔

گیٹ کھلا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ وہ لوگ خوشی و محبت سے کوٹھی کو دیکھ رہے ہیں اور پھر مسرور صاحب کو سلام و نمستے کرنے لگے اور کہنے لگے صاحب جگ مگ کرتی ہوئی یہ کوٹھی بہت سندر لگ رہی ہے۔ یہ سدا اَمر رہے یہ کوٹھی ہم لوگوں کی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے اس کی محبت اور اس سے لگاؤ ہم لوگوں کو یہاں کھینچ لایا ہے۔ یہ ہمیشہ ہمیشہ سلامت رہے اور صاحب آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔

یہ سب باتیں سن کر مسرور احمد صاحب کے اندر کا انسان جاگ اٹھا ان کا دل بھر آیا آنکھوں میں آنسوں چھلک آئے وہ اپنے آنسو رومال سے پوچھ کر کہنے لگے یہ تم لوگوں کی طاقت محنت اور قوت بازو کا ہی نتیجہ ہے ہر کام مشینوں سے نہیں ہو سکتا

اگر تم لوگ کام نہ کرو تو مجال نہیں کہ بڑی تو کیا کوئی چھوٹی بھی بلڈنگ بن کر کھڑی ہو سکے۔ یہ کہتے ہوئے پھر مزدوروں سے کوٹھی کے اندر آنے کے لئے کہا ''آؤ تم لوگ اندر آجاؤ اور اوپر تک جا کر کوٹھی کا ایک ایک کونہ دیکھ کر آؤ۔ نیچے کے ہال میں تم لوگوں کے کھانے کا انتظام کر دیا جائے گا تم سب یہاں کھانا کھا کر ہی جانا۔ یہ سن کر مزدوروں کی آنکھوں سے خوشی محبت اور احترام کے آنسو نکل پڑے وہ سب اپنے صاحب کے لئے دعا کرنے لگے صاحب! اوپر والا آپ کو سکھی رکھے اور آپ کو بہت دے۔ یہ کہتے ہوئے سب کے سب اپنے جوتے وچپلیں باہر اُتار کر اندر داخل ہو گئے کبھی وہ خود کو اور کبھی کوٹھی کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کو اس وقت سب سے زیادہ جو جذبہ لبھا رہا تھا وہ تھا مسرور محمد خان صاحب کا احساس جو مزدوروں کے لئے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

اصغری

اصغری نے شادی کے پانچ سال پورے کر لئے تھے ایک بچی پیدا ہو گئی تھی جو اب چار سال کی تھی ۔ اصغری بہت باتونی خاتون تھی ۔ کام بہت صفائی سے کرتی خود بھی صاف کپڑے پہنتی اور گھر کو بھی صاف ستھرا رکھتی تھی لیکن طبیعت مراقی ہونے کی وجہ سے کام میں بہت دیر لگ جایا کرتی تھی ۔ باتوں میں اُلٹ پھیر کرنا، اور ایک بات کو بار بار کرنا یہ اس کی عادت میں شامل تھا۔

اصغری کا شوہر سبزی منڈی میں کام کرتا تھا۔لڑائی جھگڑے تو ان لوگوں میں عام طور پر ہوتے ہی ہیں پھر بھی وہ اپنی بیوی و بچی کا خیال رکھتا کبھی سائیکل پر بٹھا کر وہ اپنی بیوی و بچی کو سنیما لے جاتا کبھی بازار گھومنے پھرنے لیجاتا ۔ زندگی ہنسی خوشی کے ساتھ گذر رہی تھی اصغری پکے سانولے رنگ کی اچھے ناک نقشے کی گھنگروالے بالوں کی خاتون تھی۔

ایک دن اصغری اپنے میاں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُلجھ پڑی تکرار ہوتی گئی آخر جھگڑا بڑھ گیا اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ اصغری کے شوہر متین نے اس کو طلاق دیدی ۔ طلاق دینا اور لینا تو بہت آسان ہے لیکن اس کے نتائج نہایت تکلیف دہ ہوتے ہیں ۔

میاں کے لئے بھی اور بیوی کے لئے بھی پھر اگر بچہ ہو تو ساری زندگی ماں

سے یا باپ سے دور ہو جاتا ہے۔ تین لوگوں کی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ رو کر جھینک کر آخر زندگی کو نبھانا پڑتا ہے کبھی دماغ خودکشی کی جانب راغب ہو جاتا ہے۔ لیکن دین و مذہب کا خوف آدمی و عورت کو لرزا دیتا ہے پھر بھی اس کے باوجود کبھی کبھی وہ نوبت بھی آجاتی ہے کہ کسی طرح برداشت نہیں ہو پاتا اور وہ اپنے آپ کو موت کے منہ میں دیدیتا ہے۔

طلاق کے بعد متین نے اپنے بیٹی کو تو پاس رکھ لیا اور بیوی کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "تیرا جہاں دل چاہے رہ لے! کیا کرتی بیچاری اس میں تھوڑی عقل کم تھی مگر وہ بہت محنتی تھی۔ وہ اپنی طاقت وہمت پر بھروسہ کر کے کرائے کا مکان ڈھونڈنے نکل گئی۔ ایک نیک خاتون نے اس کے بھائی بھاوج کی سفارش پر اس کو اپنے گھر کے سرے کا ایک کمرہ دے دیا۔ جس میں ساری سہولت تھی پاس میں ہی لیٹ باتھ تھا کمرے میں ہی کچن تھا۔

شروع میں تو وہ گھر میں کام کر کے اپنا کرایہ اسی میں چکا دیتی تھی لیکن بعد میں مکان داروں کے رشتے داروں میں نوکرانی کی سخت ضرورت تھی تو نسیم بیگم نے اصغری کو ان کے گھر کام پر لگا دیا۔ اصغری صولت جہاں کے گھر پر دن بھر کے لئے کام کرنے جانے لگی رات کو آکر نسیم بیگم کے گھر پر اپنے کرائے کے کمرے میں سو جاتی۔

اصغری کے کام سے سب خوش تھے اور وہ بھی وہاں خوشی خوشی کام کرتی تھی صولت جہاں کا گھرانا اچھا خاصا پیسے والوں کا گھرانا تھا۔ ان کے گھر کے کچھ لوگ فارن میں بھی تھے جو استعمال کی چیزیں باہر سے لاتے رہتے تھے۔ صولت جہاں

شیمپو تیل سینٹ پاؤڈر لپ اسٹک وغیرہ کا استعمال کرتی تھیں اصغری کیونکہ جوان تھی وہ بھی ان چیزوں سے متاثر ہوتی اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ بھی یہ چیزیں استعمال کرے اور سجے دھجے ۔کبھی کبھی وہ صولت جہاں کی سنگھار کی چیزیں استعمال کر لیتی اس پر وہ ناراض ہو کر کہتیں ''اصغری تجھے اتنی تنخواہ ملتی ہے تو یہ چیزیں اپنے پیسوں سے لے آیا کر۔ میری چیزوں کو اب ہاتھ نہ لگانا'' اصغری کو یہ بات سمجھ میں آگئی اور اس نے کہا اچھا ٹھیک ہے باجی !! صولت جہاں کے گھر میں ان کے شوہر وسر صاحب کے کام کرنے کے لئے ایک لڑکا راکیش نام کا ملازم کی حیثیت سے کام کرتا تھا اوپر کے بھی کام اس کے ذمے تھے ۔وہ کچن کے کاموں میں بھی اصغری کا ہاتھ بٹانے لگا۔

کچن میں دونوں ایک ساتھ کام کرتے کرتے ایک دوسرے کے قریب آگئے دونوں کھانے پینے میں ایک دوسرے کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگے ۔خیال رکھنے کی یہ صورت بڑھتی گئی دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے یہاں تک کہ وہ سوچنے لگی کہ کیا کریں ایک ہندو ایک مسلمان اصغری اپنی مکان مالکن سے آکر رازداری سے کچھ پوچھتی اس پر وہ ہمدردی کے طور پر سختی سے ڈانٹ دیا کرتیں ۔

صولت جہاں کے یہاں اصغری کو ایک خالی کمرہ مل گیا تو وہ اپنا سامان باندھ کر وہیں لے گئی اور کرائے کا نسیم بیگم کا کمرہ خالی کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک صبح ایسی آئی کہ اصغری اور راکیش دونوں گھر سے غائب تھے دو چار دن تک ان کا پتہ نہیں لگا۔ ایک دن خبر ملی کہ اصغری اور راکیش کا نکاح ہو گیا اصغری نے راکیش کو مسلمان کر لیا۔

دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے ۔سب کو ایک طرح کا اطمینان ہوا

چلو مسلمان کر کے نکاح کر لیا ہے ۔ راکیش کے خاندان والوں نے بہت مخالفت کی لیکن راکیش کہیں چھپتا چھپاتا کرائے کا مکان لے کر اصغری کے ساتھ رہتا رہا یہاں تک کہ اس کی ایک بیٹی پیدا ہو گئی جو دو سال کی ہو چکی تھی ۔

لیکن راکیش کے ماں باپ اسے گلے لگانے کو تیار نہیں ہوئے تھے پھر بھی اصغری کے ساتھ گذر ہوتی رہی ۔ آخر راکیش کا دل اصغری سے بھر گیا اس کے سر پر کوئی کچھ کہنے سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ وقتی طور پر مسلمان ہو گیا تھا وہ دوبارہ اپنے سماج میں لوٹ جانا چاہتا تھا ۔ رات کو آپس میں ان دونوں میاں بیوی میں کچھ نوک جھونک ہوئی پھر کافی کچھ کہا سنی ہو گئی اور لڑائی بڑھ گئی اور صبح ہوئی تو ایسی کہ بیچاری اصغری اپنے کمرے میں اکیلی تھی ۔ اپنی روتی ہوئی معصوم بچی کو یوں ہی بہلا رہی تھی ''تو روتی کیوں ہے تیرے لئے تو میں ہوں نا میں ہوں تو چپ ہو جا ایک دن تیرے ابا لوٹ کر آئیں گے'' اب اصغری کے گھر کے باہر مسائل کا سمندر تھا اور وہ سوچ میں ڈوبی رہتی کہ کس راستے کو اپنائے ۔

☆☆☆

ہمت سے

نزہت کی چچازاد بہن جوہی کی شادی کی تاریخ قریب آگئی تھی شادی کی تیاریاں آب وتاب پر تھیں ۔رشتے داروں کی بچیاں بیٹیاں برابری والی لڑکیاں زور شور سے تیاری میں مصروف تھیں ۔ شادی کے کارڈ بٹ چکے تھے ۔جہیز کے جو لوازمات ہوتے ہیں سب تیار ہو چکے تھے ۔آخر نکاح وبارات کا دن آگیا۔

نہیں تھیں نزہت کی سگی بہنیں جوہی چچازاد بہن تھی۔ جوہی کی شادی ایک خوبصورت شادی ہال میں ہو رہی تھی جو نہاہت حسین سجایا گیا تھا۔سارے مہمان جمع ہو گئے تھے رشتے داروں کی بیٹیاں لڑکیوں کے جھرمٹ زیور کپڑے رنگین خوبصورت اور طرح طرح کے ماڈرن اسٹائلوں سے بجی لڑکیاں اپنے اپنے گروپوں میں ہنس بول رہی تھیں کسی نے اپنے بالوں کو رنگوایا تھا کوئی بیوٹی پارلر جا کر بجی تھیں کسی نے ایک دوسرے کا میک اپ کیا تھا ۔یہ لڑکیاں ناز وانداز بنا بنا کر چلتیں ایک ایک قدم اسٹائل سے اٹھاتیں کبھی کسی کی مہندی دیکھ رہی تھیں کبھی کپڑے وچوڑیاں وزیور جوتے وغیرہ سب ایک دوسرے کی چیزیں دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے کی چیزوں پر تبصرہ کرتیں۔

شادی میں جوان لڑکیوں دوشیزاؤں اور کم عمر خواتین کا زور ہوتا ہے ۔ان کے انداز وسنگھار سب کو ہی لبھاتے ہیں ۔بجی سنوری لڑکیوں وخواتین میں ایک ایسی

کم عمر خاتون نمایاں طور پر نظر آرہی تھیں بہت خوبصورت و حسین تھیں انہوں نے آرائش والی ایک بھی چیز کا استعمال نہیں کیا تھا کوئی نیا کپڑا ان کے تن پر نہ تھا کپڑا زیور چوڑیاں مہندی نہ ہی اچھی چپل۔ یہی نہیں وہ ململ کی سفید ملگجی اوڑھنی اوڑھے ہوئے تھیں اور سر آگے تک ڈھکا ہوا نظریں بھی جھکی ہوئی۔ خاموش خاموش اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں اس محفل کے قابل نہیں ہوں۔ میں اس محفل میں کیوں آگئی میرا حق ان خوشیوں کی محفلوں پر نہیں، مجھ کو لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے میرا سایہ ان کو اچھا نہیں لگے گا۔ جب کوئی لڑکی پاس آکر ان سے باتیں کرتی تو نزہت سہم جاتی وہ خاموش واداس ہو جاتی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی ۔نزہت کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر واپس چلی جائے۔

جب اس کی دوست و برابر والی لڑکیاں اپنے ساتھ بلاتیں تو وہ جانے سے انکار کر دیتی۔ بس وہ تو ایک ہی جگہ بیٹھی یا کھڑی رہی۔ گھومنے پھرنے اور ہنسنے بولنے کو اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا وہ تو اپنی دونوں بڑی بہنوں کے اصرار کرنے پر مشکل سے شادی میں آگئی تھی جو بیویاں نزہت کو جانتی نہیں تھیں وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اس لڑکی کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے یہ ہنس رہی ہے نہ کچھ بات کر رہی ہے بار بار اس کی چشم نم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے اشکوں کو پوچھ لیتی ہے۔

دو تین خواتین نے نزہت کے قریب آکر اس کے رشتے داروں سے پوچھا کہ ''یہ کون ہیں''؟ جواب ملا ''یہ بیوہ ہیں'' ان کے شوہر کا جوانی میں انتقال ہو گیا ہے جوان سے بے پناہ محبت کرتے تھے قیمتی سے قیمتی لباس زیب تن کر کے جب وہ اپنے

شوہر کے ساتھ نکلتی تھیں تو لوگ ان کو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے ۔ گوری جھنک رنگت نیلی آنکھیں جیسے جھیل میں کنول کھلتا ہوا لمبے لمبے بھورے رنگ کے کھلے ہوئے بال سیمی بدن ہونٹ گلاب کی سرخ پنکھڑی کی طرح وہ شوہر کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر مسکراتی ہوئی چلتی تو لوگ دور تک دیکھتے رہتے تھے اب یہ اس طرح ہیں ہی نہیں کہ ''زندہ ہے'' اب ان کو ہمت سے جینا ہے۔

نزہت کی دو بہنیں وہیں تھیں وہ کہہ رہی تھیں کہ نزہت کی دل جوئی کرنا ہم سب کا ہی فرض ہے اس کو خوش رکھنے کے لئے دل جوئی کرنا ہوگا اس کے دل و دماغ کو جینے کے لائق بنانا ہوگا اس کو تین بچوں کی پرورش بھی تو کرنا ہے ۔اگر نزہت اداسی کی چادر اوڑھے رہیں گی تو ان کے معصوم بچے بھی دکھوں کی گہری کھائی میں ڈوب جائیں گے خدارا ان کو صبر جمیل عطا فرما۔

شوہر کے انتقال کو چھ مہینے ہو چکے ہیں اتنے دنوں میں یہ آج شادی میں پہلی بار آئی ہیں ۔ان کی اداسی خاموشی و ویرانی کو ختم کرنا ہے ورنہ ان کے یہ تین بچوں کی پرورش ٹھیک طریقے سے کیسے ہو پائے گی؟

نزہت کے بارے میں دریافت کرنے والی وہ خواتین سہم کر رہ گئیں اور انہیں نزہت کی بہنوں کی باتیں سن کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں اور اس کو سمجھانے لگیں ''پیاری بہن زندگی کو اچھی طرح گذارنے پر اللہ راضی ہوتا ہے اور آپ کے شوہر کے روح کو بھی تسکین ہوگی اگر آپ اچھی طرح رہ کر شکر کے ساتھ زندگی گذار دیں گی تو ایک مثالی خاتون بن جائیں گی ۔

اپنے اندر ہمت وحوصلے سے آپ یہ دکھا دیجئے کہ اپنے شوہر کی پیاری بیوی اپنے شوہر کے لئے اس کے بغیر بھی اس کے بچوں کو وسماج کو ایک اچھی راہ دکھا سکتی ہے خدا کی رضا میں راضی ہو کر ایک مضبوط خاندان کی تعمیر کر سکتی ہے۔ خواتین سے یہ باتیں سن کر نزہت کا جھکا ہوا سر کچھ اوپر اٹھا اس کی آنکھوں کی نمی دور ہوگئی اور اس کے چہرے پر سکون عزم وحوصلے کے آثار نمایاں ہو گئے۔

☆☆

گرل

ممتاز اپنی کار ڈرائیو کرتا ہُوا شام کو اپنے گھر کی جانب لوٹتا۔ اُس وقت اکثر اُس خوبصورت سڑک کے کنارے ایک لڑکی کو کھڑا ہوا پاتا۔ وہ لڑکی اُس کار کو بہ غور دیکھتی رہتی۔ ممتاز نے اُس پر کبھی دھیان بھی نہ دیا۔ وہ سڑک بہت دلفریب جھاڑیوں و پھول دار پودوں سے آراستہ تھی ایک جانب آنے والوں کے لئے راستہ تھا دوسری جانب جانے والوں کے لئے۔

ایک دن، رات آٹھ بجے کے قریب ممتاز اپنے کاروبار سے فراغت پا کر حسبِ معمول اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ کار کچھ سُلو چل رہی تھی۔ اتفاق سے ممتاز کی نظر اُس لڑکی پر پڑ گئی جو اکثر اُس جگہ کھڑی ہو کر کسی کا انتظار کرتی تھی ممتاز کو اُس کے بارے میں کوئی کھوج ہوئی نہ ہی اُس نے کبھی اُس سے باز پُرس کی۔

جیسے ہی ممتاز کی نظر اُس پر پڑ گئی تو فوراً لڑکی نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر رُک جانے کے لئے اِشارہ کیا۔ یہ لڑکی جینس و شارٹ کرتا پہنے ہوئے تھی سر پر اس طرح دوپٹہ بندھا ہُوا تھا کہ سارا چہرہ پوشیدہ تھا گھٹان باندھ رکھی تھی صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ لباس ماڈرن، پردہ ایسا کہ چہرہ کوئی نہ دیکھ سکے یہ عجیب راز تھا۔

جب اُس ماڈرن لڑکی نے ہاتھ کا اشارہ دے کر گاڑی روکنے کے لئے کہا تو ممتاز نے اپنی سُلو چلتی ہوئی کار کو روکا۔ اور پوچھا "محترمہ فرمایئے آپ کیا کہنا چاہتی

ہیں میں نے آپ کو پہچانا نہیں ! آپ کون ہیں ؟

ایک لمحہ کے لئے اُس لڑکے نے اپنے چہرے پر بندھا ہوا کپڑا ہٹایا اپنے سُرخ ہونٹوں کو دکھاتی ہوئی بولی'' میں کال گرل ہوں'' ممتاز کا ذہن جاگ اُٹھا اس کا اس طرح کا کبھی کسی سے کوئی واسطہ نہ پڑا تھا وہ گھبرا کر بولا تو میں کیا کروں ؟ مجھ کو آپ نے کیوں روکا ہے ؟ کال گرل نے کہا آپ کچھ نہیں جانتے چلئے آپ میرا موبائل نمبر لے لیجئے میں آپ کو سب کچھ بتلادوں گی ۔ممتاز آخر خود ہی سب سمجھ گیا اُس نے کہا جی'' مجھ کو اس کی ان باتوں کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے ۔ میں اس ماحول کا پروردہ نہیں ہوں اِن باتوں سے سخت نفرت کرتا ہوں اور ایسے لوگوں سے بھی''۔

دوسرے دن اسی طرح ممتاز جب اپنے گھر کی جانب کار میں جارہا تھا تو اُس کا من چلا مگر شریف دوست فرید ساتھ میں تھا۔ممتاز فرید کو یہ بات بتا چکا تھا جیسے ہی سڑک کے اس مقام پر کار گئی جہاں وہ کال گرل کھڑی مِلی تھی دیکھا کہ وہ کسی کی منتظر تھی وہ اُس کار کو دیکھ کر کچھ سوچنے لگی ۔فرید نے ممتاز سے کہہ رکھا تھا کہ دیکھیں وہ کیا کیا بتاتی ہے میں وہاں روکوں گا اُس سے حالات معلوم ہونگے ۔ میں بھی اس کے سوداگروں کی فہرست میں شامل ہو کر حالات سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں ۔

کار ۔رُکی اور فرید گاڑی سے اُتر گیا ممتاز آگے بڑھ گیا فرید نے اس لڑکی کی جانب دیکھا وہ اِٹھلاتی مسکراتی ہوئی بولی'' کہئے مسٹر! آپ کے دوست نے آپ کو میرے لئے چھوڑ دیا ممتاز بھی ظاہری طور پر مسکرایا اور گویا ہوا ۔ہاں اب کہئے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں وہ لڑکی نے پھر دہرایا'' میں کال گرل ہوں مجھ کو موبائل پر بات کر کے جو بھی جہاں بلاتا ہے میں وہاں جاتی ہوں ۔ایک جگہ طے کرلی جاتی ہے کون

کہاں ملے گا پتے اور ٹھکانے ہم لوگ طے کر لیے جاتے ہیں پھر وہاں سب مل جاتے ہیں ہماری اور فرینڈس بھی ہیں ہمارا بہت بڑا گروپ ہے جب بھی جہاں جو بلاتا ہے مَیں وہاں جاتی ہوں کون کہاں ملے گا ہم لوگ یہ طے کر لیتے ہیں ہمارا بڑا گروپ ہے جہاں جس کا کام سیٹ ہو جائے ہم لوگ اس کو ایڈجسٹ کرتے ہیں اس میں ہم لوگ بہت پیسہ کما لیتے ہیں اور خوب مزے سے عیش و آرام کی زندگی گذارتے ہیں۔

فرید کا ذہن بے چین ہو گیا ذہن ملامت کرنے لگا ہے وہ بہت گھبرایا اور دل میں سوچنے لگا میں یہاں یہ باتیں کرنے پوچھنے کے لئے کیوں رُک گیا!! اگر گھر والوں کو معلوم ہو گیا تو بہت باتیں سننا پڑیں گی اور کسی نے ذرا بھی کچھ سن لیا تو بلاوجہ کی بدنامی ہاتھ لگے گی۔ وہ بہت گھبرایا اور پریشان ہُوا آخر اُس نے اپنا پہلو بچایا اور کہا "اے کال گرل آج تم جس کے لئے کھڑی ہو اُسی کے ساتھ چلی جاؤ"

آخر فرید کا دھیان ان خواتین کی جانب گیا جو صبح سے شام تک محنت کر کے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں ساتھ میں اپنی عزت کو بچائے رکھتی ہیں۔ آنکھوں میں شرم وحیا لحاظ عزت و وقار چاہے گھر میں کام کریں فیکٹریوں میں اسکولوں یا آفسوں میں۔

جب فرید نے ممتاز کو ان باتوں سے آگاہ کیا تو ان دونوں کا دل بے چین ہو گیا انہوں نے چاہا کہ سرکار کو متوجہ کریں کہ سڑک پر منہ چھپائے لڑکیوں کی چیکنگ ہونا چاہئے۔ ان کو غلط راستے سے بچانا بہت ضروری ہے۔ مرد کال گرل کے چکروں میں رہیں اور بیویاں گھروں میں بیٹھی اپنے شوہروں کا انتظار کرتے کرتے بھوکی سو جائیں۔

بد کردار لڑکیاں عیش و آرام کی زندگی گزاریں اور محنت کرنے والی خواتین

کسم پرسی سے اپنے گھروں کو چلائیں وہ محفلوں کو سجائیں اور دوسری طرف شریفوں کا سکون چین بھی چھین لیں۔ بے چینی واضطرابی، غم وغصہ اُن کے ہاتھ آئے!

ممتاز اور فرید دونوں دوستوں نے اسکے خلاف ٹھوس قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا اور اپنے دوستوں کو ساتھ لیکر اسکیمیں ومنصوبے بنانے میں جٹ گئے۔

ایک دن ایسا آیا اُسی سڑک پر پولس کی گاڑی آئی اور وہاں کھڑی ہوئی اُس لڑکی کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر ذِلّت کے ساتھ پوچھ تاچھ کے لئے پکڑ کر لے گئی۔

☆☆

میں اب تم سے ۔۔۔

خالو جان ہاسپٹل میں داخل تھے ۔وہ پرائیویٹ ہاسپٹل تھا آنے جانے والوں کا ایک سلسلہ بندھا رہتا تھا۔

تابش بھی اپنی ممی کے ساتھ روز روز ہسپتال جاتی تھی۔ایک تو خالوجان کی محبت پھر رشتے داروں کے ملنے جلنے آنے جانے لگے رہتے تھے ممی کو بھی آنے جانے کے لئے ایک ساتھ چاہئے تھا تابش کے پاپا جب دیکھنے جاتے تو رات کو ہی جاتے دن میں ان کو فرصت نہ ہوتی خالوجان کی دو بیٹیاں تھیں جو شادی شدہ تھیں۔ وہ بھی اپنے اپنے بچوں کو گھر پر چھوڑ کر باری باری سے ملنے آتی رہتیں۔

خالوجان کی طبیعت میں سدھار ہو رہا تھا۔تابش نے دیکھا کہ پاس والے وارڈ میں سے ایک خوبصورت حسین نوجوان لڑکا نکلا جو زینے سے اترتا ہوا گنگنا رہا تھا اس کی نظر تابش پر پڑ گئی اس نے اپنے حسن کی کرنیں تابش کے چہرے پر جما دیں۔ تابش کا دلکش چہرہ نرگسی خمار آلود آنکھیں جو ہر ایک کو گھایل کر دیتی تھیں گندمی رنگ بڑی بڑی جھکی ہوئی گھنی پلکیں مترنم آواز ہر ایک کا دامنِ دل کھینچ لیتی تھی سفیدی کم سرخی مائل رخسار ہلکے گلابی ہونٹ جب لب کشا ہوتے تو گلستاں کی سیر کا لطف آجاتا ۔لیکن یہ ظالم لڑکی اپنی گھنی پلکوں سے گھونگھٹ لئے رہتی اور نظر اوپر اٹھا کر کسی کو نہ دیکھتی لیکن تابش کو یہ شخص متاثر کر گیا۔

جب تابش پر اس نوجوان نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے بجلیاں گرادیں پھر کیا تھا گھبرا کر تابش پوچھ بیٹھی آپ مجھکو اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں جانی نے جواب دیا۔"اس لئے کہ میں نے آج تک آپ کی طرح دلکش وخوبصورت لڑکی نہیں دیکھی! چہرہ ہے جیسے جھیل میں ہنستا ہوا کنول جیسے کسی شاعر کی غزل وغیرہ وغیرہ۔تابش شرما گئی لجا گئی۔ناراض نہیں ہوئی۔کیوں کہ وہ بھی اس شخص سے متاثر ہوگئی تھی۔

اس کی خوبصورت آنکھیں جیسے مئے کے پیالے بھرے ہوئے ہونٹوں پر حسین گیت آواز میں گیتوں کا ترنم گورا رنگ عاشق کا سا حسین انداز درمیانہ قد سے تھوڑا نکلتا ہوا گھونگر والے بال۔گہرے نیلے رنگ کی پینٹ ہلکی شرٹ پہنے ہوئے متاثر کن شخصیت کا مالک نظر آرہا تھا۔تابش بھی اس کی حسین نظروں سے متاثر ہوگئی۔اپنی نرگسی آنکھوں کو اٹھا کر دیکھا پھر مسکراتے ہوئے پلکوں کو جھکالیا۔

جانی نے بات کرنے کے لئے سوال کیا کہ آپ کا یہاں کون ایڈمٹ ہے؟ آپ کسے دیکھنے آئی ہیں؟ تابش نے جواب دیا میرے بڑے خالوجان داخل ہیں۔مزید وہ پوچھنے لگا اب ان کی کیسی کنڈیشن ہے وہ کب تک داخل رہیں گے آپ ہاسپٹل کب آتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جانی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تابش مسکرائی پھر جواب دیا میں وہ تین چار دن کے بعد ڈس چارج ہو جائیں گے۔مزید سوال کیا آپ کہاں رہتی ہیں؟ تابش جو کبھی بھی کسی کو لفٹ نہیں دیتی تھی لیکن جانی کو وہ لفٹ دے رہی تھی جانی کو دیکھ کر تابش کو ایسا لگا جیسے اس کو اپنا جیون ساتھی مل گیا ہو اور وہ اس کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔تابش نے بھی پوچھ لیا آپ یہاں کس کو دیکھنے آئے ہیں

جواب میں جانی نے کہا یہاں میری بھابی ایڈمٹ ہیں وہ چار دن اور رُکیں گی ان کے آپریشن سے بابا پیدا ہوا ہے۔

پہلے مسرت پھر تشنگی کی لہر دوڑ گئی پھر بھی ایک دوسرے کا پتہ معلوم کر کے وہ خوش تھے کہ بعد میں بھی ملنے کے چانسیز حاصل ہو سکیں گے۔

تابش اور جانی ہر روز ایک ہی وقت پر زینے کے پاس ملتے جانی گیت گاتا گنگناتا اس کی آواز میں بھی ایک جادو تھا تابش اس کے گیتوں میں ڈوب جاتی پھر وہ دونوں اتر کر نیچے لان میں بیٹھ جاتے ۔تابش نظریں بچا کر اس سے ملتی رہتی ۔بعد میں اس کو پتہ چلا کہ جانی ایک بڑا سنگر ہے گٹار بہت ہی اچھا بجاتا ہے آواز میں بڑی دلکشی ہے اسٹیج پروگرام دیتا ہے۔یہ ایک مشہور گلوکار ہے۔تابش کی آواز بھی بہت اچھی تھی اس کو گانے سننے کا اور گانا گانے کا بہت شوق تھا۔وہ اپنی پڑھائی پوری کر چکی تھی۔تابش کے بہت سے رشتے آتے رہتے لیکن اس کو پسند نہیں آتے تھے اس لئے اس کی ممی کو واپس کرنا پڑتا تھا تابش اب دل ہی دل میں مطمئن تھی کہ اب میں ممی پاپا کو بتا دونگی کہ ایک لڑکا مجھ کو پسند آگیا ہے اب آپ لوگ شوق سے میری شادی کر دیں۔

ملاقات کا تیسرا دن تھا جانی نے تابش کو لان میں بیٹھے پا کر ایک خوبصورت گیت سنایا۔اس کی آواز نے اور گیت نے تابش کو مدہوش کر دیا تابش نے یہ سوچ لیا کہ یہی میرا چاہنے والا ہے مجھ سے یہ اتنا متاثر ہے جیسے کہ میں اس کی امانت ہوں مجھ کو ایسا لگتا ہے میرا من پسند ساتھی مل گیا ہے اس کی آواز میں اسکی گیتوں میں کتنی مٹھاس ہے کتنی کشش ہے وہ سچ مچ ایک حقیقی عاشق ہے میرے دل کو اس کی آواز و انداز چھو رہا ہے مکان روپیہ پیسہ جتنا بھی جو کچھ بھی اس کے پاس ہوگا میں اس پر ہی خوش و راضی ہو جاؤں گی۔قدرداں ،محبوب کی طرح محبت کرنے والا شوہر بڑی

قسمت والوں کو ملتا ہے وغیرہ وغیرہ تابش کی دنیا تین دن میں آباد ہوگئی اور وہ اپنی زندگی کے حسین سپنے سجانے لگی۔

ملاقات کا چوتھا دن تھا جانی کی بھابی کے وارڈ میں بہت سے لوگ بچے کو دیکھنے آئے تھے جانی بھابی کے وارڈ سے باہر نکلا ہی تھا کہ اتنے میں ایک لڑکی بچے کو لیکر باہر آئی اور کہنے لگی لو تم اپنی بچی کو بھی گھمالاؤ یہ چھوٹی بھابی کو پریشان کر رہی ہے۔

یہ سنکر تابش کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گیے سر چکرا گیا آنکھیں پھٹی رہ گئیں اس نے تابش سے گھبرا کر پوچھا یہ کون ہے۔اپنی چھوٹی بہن کے سامنے جانی کی جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔آخر جانی کو بتانا ہی پڑا کہ یہ میری بیٹی ہے۔تابش کی سوالیہ نظریں جانی پر جم گئیں۔اس کو یقین نہیں آرہا تھا۔تابش نے جانی کی بہن سے پوچھا کہ ان کی مسز کہاں ہیں؟ اس کی بہن نے وارڈ میں لے جا کر جانی کی مسز سے ملوادیا۔

پھر کیا تھا تابش کا چہرہ مرجھا کر خزاں رسیدہ زرد گلاب ہوگیا تھا زندگی سے بھرپور اس کے دل کے تار ٹوٹ گیے زندگی کی امنگیں ختم ہوگئیں "نرگسی آنکھوں کی چمک" غائب ہوگئی افسردہ ہونٹ سرد سرد احساس دل ڈوبا جارہا تھا۔جانی کی جانب دیکھتے ہوئے تابش نے کہا اب میں تم سے کبھی نہیں مل سکتی۔

جانی بہت شرمندہ تھا بڑی مشکل سے وہ یہ کہہ پایا کہ میں تم کو بتلا نہیں سکا اس لئے کہ میں تم کو کھونا نہیں چاہتا تھا اور اب بھی میں تم کو کھونا نہیں چاہتا!

تابش نے سرد آہ بھرتے ہوئے پھر وہی دہرایا میں "اب تم سے نہیں ملوں گی"

☆☆

اوہام پرستی

نیلو کی بڑی امی نیلو کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں ۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی سے اپنے شوہر کے زمانے میں ہی فارغ ہوگئی تھیں گھر میں ایک بیٹا بہو اور دو پوتے تھے ۔ بیٹا بینک میں سروس کرتا تھا پر سکون حالات تھے ۔ چنانچہ وہ اپنے دیور کی بیٹی کی شادی میں اپنی دیورانی کے ساتھ مصروف ہوگئیں ۔ دولہا پسند کرنے میں بات چیت میں کپڑے پسند کرنے سلوانے اور زیورات بنوانے میں ہر ایک بات میں دیورانی کے ساتھ شریک رہیں ۔ دیورانی کے گھر میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا یہ ان کے گھر کی پہلی شادی تھی ۔

شادی کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں تاریخیں طے ہوگئیں۔ ہر کام میں نیلو کی بڑی امی آگے رہیں ان کی دیورانی ان سے تمام کاموں میں مشورے لیتی رہیں۔ نیلو کی بڑی امی گھر کی سب سے بڑی بہو تھیں اور دو دیورانیاں تھیں نیلو کی ممی دوسرے نمبر کی بہو تھیں ۔ بڑی امی کے شوہر کے انتقال کو تین سال کا عرصہ گذر چکا تھا بڑی امی بڑی ہوشیار سمجھدار اور کاموں میں منتظم تھیں سب ہی تیاری انہوں نے اچھے طریقے سے کروادی ۔

خاندان کے سبھی لڑکے لڑکیاں ان سے بہت پیار کرتے تھے ان کو بڑی امی کہہ کر بلاتے تھے یہ سب لوگ ایک ہی گھر میں الگ الگ حصوں میں رہتے تھے یہ

گھر بہت وسیع اور کشادہ تھا۔ نیلو کی شادی کی خوشیاں منانے کے لئے سب منتظر تھے اُبٹنا لگانے کا دن بارات سے دو دن پہلے طے کیا گیا تھا۔ لڑکے ولڑکیاں گیتوں میں سوال وجواب کی تیاریاں کر چکے تھے۔ آپس میں ڈانس وگانوں کے پروگرام بھی طے ہو چکے تھے۔

لڑکیاں داماد سب ہی مل جل کر بیٹھے سارے بچے وجوان اُبٹنے کی رسم کے لئے ایک خوبصورت سجے ہوئے ہال میں اسٹیج کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے باقی مہمانوں کے لئے کرسیاں قطار در قطار لگادی گئی تھیں۔ کھانے پینے سے فراغت پاکر اب نیلو کو اُبٹنا لگانے کے لئے جوان لڑکیاں سہاگنیں بہنیں عزیز ورشتے دار سب منتظر تھے۔

سب سے پہلے دلہن کو ایک خوبصورت اسپیشل کرسی پر بیٹھایا گیا۔ سات سہاگنوں کو اُبٹنا لگانے کے بعد دلہن کو ابٹنا لگایا جاتا ہے پانچ سہاگنوں کو اُبٹنا لگے کے بعد بڑی امی کی چھوٹی بیٹی کی جانب افشاں نے جب ماتھے پر ابٹنا لگانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اسٹیج کے پاس کرسیوں پر بیٹھی ہوئی دو تین خواتین نے افشاں کو اشارے سے منع کردیا اور دوسری سہاگنوں کی جانب اشارہ کیا۔

بڑی امی کی چھوٹی بیٹی ریشماں چھ مہینے پہلے بیوہ ہو چکی تھیں ان کے خوبصورت شوہر سڑک حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ جب ریشمہ نے خواتین کی یہ کیفیت دیکھی تو اس کا دل بھر آیا چہرہ سرخ ہو گیا موٹی موٹی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑیاں لگ گئیں لب کانپنے لگے وہ آنسو اپنے آنچل میں چھپا رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے موتی نما اشکوں کی بارش ہونے لگی وہ ایک دم سہیلیوں کی جھرمٹ سے

الگ ہوگئی اور اسٹیج سے اُتر گئی ان کی ڈبڈبائی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ہار پھول کپڑے سب دھندلے دکھائی دینے لگے۔اس کو لگتا تھا وہ اب گری اب گری۔

بدنصیبی کا دامن تھامے ہوئے وہ اپنے آپ کو گناہگار قصوروار محسوس کرنے لگی کہ ہائے میں کیوں اُسٹیج پر جا کر کھڑی ہوگئی تھی !!میں کیوں یہ بھول گئی تھی کہ میں تو بیوہ ہوچکی ہوں میری پرچھائیں دوسروں پر کیوں پڑی۔

ریشماں کی کیفیت دیکھتے ہوئے اس کی بڑی بہن اور اس کی امی سُدھ بُدھ کھو بیٹھی خوبصورت گلاب کی لڑیاں اپنے حسن ورنگ بو کے باوجود بے رنگ وبے نور اور مرجھائی ہوئی نظر آنے لگیں کیونکہ ریشماں کا دل اشکوں کی جھیل میں ڈوب چکا تھا۔ریشماں کے برابر والی لڑکیاں وسہیلیاں بھی اس کے ساتھ جھنجھلاتے ہوئے اسٹیج سے اتر کر نیچے لگی ہوئی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔

اور بڑی امی جو اپنے ہاتھوں میں بڑا سا خوبصورت ہار لئے ہوئے دلہن کے بہنوی کے گلے میں ڈالنے کے لئے کھڑی تھیں ان کے ہاتھ سے ہار گر کر زمین پر آ گرا تھا ریشماں کی پھول کی طرح بیٹی آ کر معصومیت سے اپنی امی سے پوچھ رہی تھی

”امی آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ابو تو کہتے تھے کہ ہمیشہ ہنستے رہنا چاہیے“

کچھ پڑھی لکھی سمجھدار خواتین آپس میں باتیں کر رہی تھی یہ بے معنی وبے مطلب اوہام پرستی ہمارے سماج سے آخر اب تک دور کیوں نہیں ہو رہی؟اس کا ذمہ دار کون ہے؟۔

☆☆

یہ کرائے دار

شہناز بیگم نے بہ مشکل کرائے داروں سے اپنا فلیٹ خالی کروایا ہی تھا کہ نئے کرائے دار فلیٹ لینے کے لئے چکر لگانے لگے کچھ لڑکے جو Medical College میں اسٹیڈی کر رہے تھے اپنے مالک مکان سے پریشان تھے اور ان کو پانی کی بھی سخت تکلیف تھی انہیں جیسے ہی شہناز بیگم کے فلیٹ کے خالی ہونے کی اطلاع ملی تو شہناز بیگم کے گھر پر آکر ان سے بنتی کرنے لگے "آنٹی ہمارے مالک مکان شرماجی سے ہم لوگ بہت پریشان ہیں پانی کا صحیح انتظام نہیں ہے اور وہ کئی باتوں پر ہم لوگوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ہم لوگوں کی پڑھائی میں بہت ڈسٹرب ہورہا ہے آپ کرپا کریں اور ہم کو آپ کا فلیٹ کرائے پر دے دیں۔ شہناز کے شوہر کو بالکل فرصت نہ تھی کرائے دار بھی اپنی پڑھائی میں بہت مصروف تھے انکے Exam ہونے والے تھے رات دن پڑھنے میں گذر رہی تھی۔ دو بھائی MBBS کر رہے تھے ایک بہن ششی میڈیکل کی تھرڈ درجہ میں تھی۔ ایک طرف پڑھائی میں اتنی مصروفیت۔ دوسری طرف مکان کا شفٹ کرنا۔ مسز شہناز بیگم سے جب میڈیکل کے Students دو بھائیوں نے فلیٹ کرائے پر لینے کے لئے بنتی کی۔ اور اپنی مجبوریاں بتائیں تو مسز شہناز کا دل پگھل گیا ان کے سامنے طالب علموں کی مجبوریاں ضرورتیں پریشانیاں آکر کھڑی ہوگئیں۔ Medical Students کی

پریشانیاں سن کر ان کا دل چاہا کہ ان کو فوراً فلیٹ کرائے پر دے دینا چاہئے۔ لیکن شوہر صاحب سے پوچھے بغیر وہ یہ نہیں کر سکتی تھی۔

چنانچہ شہناز نے ان سے دوسرے دن آنے کے لئے کہا اپنے شوہر سے میڈیکل کالج کے طالب علموں کو اپنا فلیٹ کرائے پر دینے کی تائید کرتی رہیں۔

شہناز کے شوہر اپنے ایک مکان کے کرائے دار شاہ رخ افسر وحمید سے چوٹ کھائے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے تھوڑے دن رکنے کے لئے کہا لیکن طالب علموں کی پریشانیاں ان کو اسی وقت گھر خالی کرنے کے لئے مجبور کر رہی تھیں۔ چنانچہ شہناز نے اپنے شوہر سے عاجزی و انکساری سے کہا کہ ایگری مینٹ کا فارم لانے و تیار کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔

بیچارے پڑھنے والے Students پریشان ہیں ان کی پریشانیاں دور کرنے میں ہم کو ان کی مدد کرنا چاہئے ہم پڑھے لکھے لوگ ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے تو پھر دنیا میں انسانیت کا کیا ہوگا؟

آخر شہناز کے کہنے پر اُن کے شوہر حبیب صاحب نے اُن تینوں بہن بھائیوں کو فلیٹ زبانی بات چیت کر کے دے دیا۔ کرائے داروں نے حبیب صاحب کو انتہائی مہذب طریقے سے مطمئن کر دیا ''انکل آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی آپ سے بنتی ہے کہ آپ کل ہی ہم کو فلیٹ میں شفٹ ہونے کی آگیہ دے دیجئے۔ اَنکل ایک بات اور بتانا ہے کہ کبھی کبھی ہمارے ماتا پتا جو گوالیار میں رہتے ہیں یہاں آکر بھی رہا کریں گے۔ کرایہ آپ کو بالکل سمیہ پر مل جایا کرے گا۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔ حبیب صاحب بھی میڈیکل طالب علموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ

سکے یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے ایک مکان کے کرائے داروں سے بہت پریشان ہوئے تھے وہ بھی بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے۔ جب آپ کہو گے آپ کا مکان خالی کردیں گے آدھی رات کو بھی آپ چاہیں گے تو ہم آپ کا مکان خالی کردیں گے۔ لیکن مکان کبھی خالی نہ گیا نہ کرایا بڑھایا۔ ایک ہی پرانا کرایہ دار دیتے رہے لوگوں سے کہہ دیا ہم نے یہ مکان خرید لیا ہے۔ لیکن پھر بھی منوج کمار اور دیپک کی باتوں سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور خود ہی کہہ اٹھے تم لوگ Students ہو تمہارے لئے ہم اپنا فلیٹ ضرور دے دیں گے لیکن گیارہ مہینے کا ایگریمنٹ کروالینا اور جو بھی کرائے داروں کے لئے ضروری ہے وہ سب کارروائی کرلینا اپنا پتہ ٹھکانہ اپنے ماتاپتا کے پُرانے گھر کا وکالج کا وغیرہ وغیرہ۔ اتنا سن کر منوج کمار نے ہاتھ جوڑ کر دھنیہ واد ادا کیا اور اَنکل کے پیر چھوتے ہوئے کہا'' اَنکل آپ ہمیں آشیرواد دیجئے ہم صحیح سے پڑھیں آگے بڑھیں اور آپ کی طرح انسان کی ضرورت کو سمجھیں۔

اَنکل نے اپنے ہاتھ سے منوج کمار کا جھکا ہوا سر اوپر کیا آشیرواد دیا بیٹا اوپر والا تم کو بہت بڑا ڈاکٹر بنائے اور تم او تمہارا بھائی دیپک وتمہاری بہن ششی خدمتی رحم وہمدردی کا پرچار و پرسار کرو۔ غریبوں کے ساتھ علاج کے درمیان فیس و دواؤں میں کنسیشن اور سب کے ساتھ ہمدردی کرتے رہنا۔ میرا تم سب کے ساتھ آشیرواد ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اس طرح وہ تینوں میڈیکل کے Students اَنکل وآنٹی کو دھنیہ واد دیتے ہوئے فلیٹ کی چابی لیکر خوشی خوشی چل دیئے اوران کو ہی اپنے کلاس فیلو و دوستوں کے ساتھ نئے فلیٹ میں شفٹ ہوگئے ایک دن میں سارا سامان جمالیا اور

پھر اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔

شہناز اور ان کے شوہر حبیب صاحب جو ایک بزنس مین تھے (اپنی سروس چھوڑ کر بزنس کرنے لگے تھے) مطمئن ہو گئے کہ چلو پڑھنے والے بچے ہیں امتحان کا وقت پھر میڈیکل کی سیریس پڑھائی جو بہت زیادہ ہوتی ہے آرام سے پڑھتے رہیں گے۔

کبھی کبھی منوج کے پاپا ممی بھی آکر رہتے لیکن حبیب صاحب کو کسی بات پر اعتراض نہ ہوتا۔ اور کرائے دار ہمیشہ شکر گزار رہتے۔ کرائے دار رہنے لگے۔ حبیب صاحب نے ایگریمنٹ کا فارم لا کر رکھا منوج و دیپک کا کہنا تھا انکل جو بھی آپ لکھوالیں ہم سب کچھ لکھنے کو تیار ہیں۔ پھر کبھی انکل کو وقت ملا نہ اُن لڑکوں کو حبیب صاحب نے جا کر دیکھا نہ ہی انھوں نے کسی بات پر انکار کیا۔

ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اچانک منوج شہناز کے گھر آتا اور دروازے میں اپنوں کی طرح داخل ہو جاتا جیسے ہی شہناز بیگم سامنے آتیں وہ تیز قدموں سے لپک کر اُن کے چرن چھو لیتا شروع شروع میں شہناز اچانک ڈر سی جاتیں لیکن پھر ان کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ شہناز بیگم کے چرن چھو کر آشیرواد لیتے اور کرایہ دے کر چلے جاتے اگر شہناز کے شوہر گھر میں ہوتے تو اُن کے ساتھ بھی وہ یہی کرتے جھک کر آشیرواد لیتے اور کرایہ دے کر چلے جاتے۔ حبیب صاحب سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کو اُن کی کامیابی کے لئے دُعائیں دیتے رہتے۔ اس طرح وقت گزرتا گیا تین سال بعد منوج کے ماتا پتا گوالیر کے رہنے والے تھے اپنا گھر بار بیچ کر اسی شہر میں آ گئے اور ایک بڑا سارا خوبصورت بنگلہ خرید لیا۔ بیٹی کی شادی کر دی وہ اپنے گھر چلی گئی اور ایک ڈاکٹر کی

بیوی بن گئی اُس کو بھی Job مل گیا۔ اور منوج و دیپک اپنی پریکٹس میں رہے آخر ایک دن دونوں بڑے ڈاکٹر بن گئے ۔ منوج کمار ہارٹ کا ڈاکٹر بن گیا۔ دیپک ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔

فلیٹ تو وہ لوگ چھوڑ چکے تھے لیکن کبھی کبھی ملنا جلنا گھر پر آنا جانا رہا۔ حبیب صاحب اور شہناز شادیوں میں بھی شریک رہے۔

ڈاکٹر منوج کی بہت بڑی سرکاری پوزیشن ہو چکی تھی۔ اُس کا شمار بڑے بڑے ڈاکٹرس میں ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر میٹنگ میں جاتا رہتا تھا۔ حبیب صاحب اپنی فیملی میں ہر طرح خوش تھے۔ اُن کا بیٹا بھی اُن کے ہی ساتھ بزنس کرتا تھا۔ بیٹے کے تین بچے ہو چکے تھے۔ بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھر کی تھیں ان کے بھی بچے تھے جو نانا سے ملنے آتے رہتے تھے زندگی خوشحالی سے گزر رہی تھی کہ اچانک حبیب میاں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ہاسپٹل لے جایا گیا تو پتہ چلا کہ ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ فوراً گھر کے داماد و بیٹے سب ہی دوڑ پڑے ان کو ہارٹ کے ہاسپٹل لے جایا گیا۔ مشینوں سے سارا چیک اَپ ہوا رپورٹیں ڈاکٹر کے پاس پہنچیں یہ تھے ڈاکٹر منوج کمار، حبیب میاں کے ہوش وحواس سب ٹھیک تھے دل کی دھڑکن بڑھی ہوئی تھی سانس کی تکلیف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر جین نے ایک گہری نظر مریض پر ڈالی، دیکھا تو وہ چکرا گیا ارے حبیب صاحب اُس کے منہ سے یہی نکلا ارے حبیب صاحب آپ تو میرے پتا سمان ہیں میں آپ کا آپریشن کرونگا ایمرجنسی کیس ہو گیا فوراً ڈاکٹر جین نے حبیب صاحب کو پرائیویٹ وارڈ میں ایڈمٹ کر لیا۔ اور ڈاکٹر جین نے حبیب صاحب کی دیکھ بھال کرنے کا ذمہ لے لیا۔ اور بہت اچھی طرح دن بھر چیک اَپ ہوتے رہے۔ آخر

دوسرے دن آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر جین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ کہہ رہے تھے اے اوپر والے میرے اس مریض کو تو جیون دے دے۔ میری لاج رکھ لے یہ میرے پتا ہی ہیں۔ میرے لئے بھگوان کے سمان ہیں۔ آخر حبیب صاحب اچھے ہو کر گھر آگئے۔ خوشیاں منائی گئیں۔ اور ڈاکٹر جین نے ہمیشہ کے لئے حبیب صاحب کی دیکھ بھال کا ذمہ لے لیا۔

ضدّی لڑکی

تسنیم ایک ضدی لڑکی اُس نے اپنے پیار کو ہی کبھی تسلیم نہیں کیا۔اگر چہ وہ فراز سے پیار کرتی تھی ۔لیکن اقرار نہیں کیا فراز نے کئی بار دل کے تاروں کو جھنجھوڑا اور کہا تسنیم I LOVE YUO لیکن تسنیم نے ان سنی کردی کبھی رُخ پھیر لیا منہ موڑ لیا اور بے نیازی ظاہر کرتی رہی فراز کی بات کو کبھی غور سے نہ سنا۔

فراز ہر وقت تسنیم کی دلجوئی کرتا رہتا اور اُس سے وعدہ لینا چاہتا پوچھتا کہ تسنیم تم مجھ سے شادی کروگی؟تسنیم نے بغیر کچھ سوچ سمجھے کہہ دیا کہ نہیں۔فراز کا موٹے۔موٹے حرفوں سے لکھا ہوا پرچہ I Love you Tasneem پڑھتے ہی پھاڑ دیا۔اُس کا سنجیدگی سے کوئی اثر نہ لیا اگرچہ دونوں کم عمر تھے چھوٹے تھے گہرے دوست تھے ۔دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت تھی لیکن لڑائی دنوک جھونک بھی چلتی رہتی تھی کوئی یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔

جب تسنیم نہ دکھتی تو فراز کی آنکھیں اس کو تلاش کرتی رہتیں ۔یہی حال تسنیم کا ہوتا تھا فراز کی غیر موجودگی سے تسنیم کے دل میں ایک خلش ہوتی رہتی اس کی نظریں فراز کو تلاش کرتی رہتیں ۔لیکن فراز نظر آجاتا تو وہ اس سے پھر بے نیازی و بے رخی کا اظہار کرتی ۔اس طرح دو چار برس گزر گئے۔

فراز بہت شریر و منچلا تھا ۔ وہ اکثر لڑکیوں کا ذکر کرتا رہتا۔وہ تسنیم سے دوسری لڑکیوں کے بارے میں پوچھنے لگتا تو تسنیم کو بہت بُرا لگتا وہ چڑھ جاتی تب فراز کہتا کہ جب تم مجھ کو نہیں چاہتیں تو دوسری لڑکیوں کے بارے میں، میں پوچھتا ہوں تو تم کو کیوں بُرا لگتا ہے۔تسنیم اس بات کا کوئی جواب نہ دے پاتی ۔دراصل اس کے دل میں محبت تھی لیکن وہ اپنے منہ سے کبھی ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی ہر وقت روٹھی روٹھی مگر دل کے قریب رہتی۔

سیدھا سادا فراز تسنیم کو ہنساتا ہر طرح دلجوئی کرتا اس کو دیکھ کر گیت گاتا مسکراتا وہ دلچسپی تو لیتی مسکراتی لیکن دور ۔دور بھاگتی رہتی تھی ایک دن فراز نے تسنیم سے کہا ''تسنیم وہ تمہاری سہیلی ہے نا نکہت تم اس سے ہماری شادی کروادینا'' اس بات پر تسنیم نے تنک کر جواب دیا ''واہ کیوں''؟ فراز جھینپ گیا اور بات کاٹ دی تب سے ہی تسنیم کے دل میں ایک دھکا سا لگا اور وہ سوچنے لگی کہ فراز ہاتھ سے نکل جائے گا۔لیکن پھر بھی وہ کسی طرح نہ جھکی ہمیشہ کھچی کھچی رہتی۔اب فراز کو یقین آرہا تھا کہ تسنیم مجھ سے شادی نہیں کرے گی کم عمری کی بات تھی آخر ایک وقت ایسا آیا کہ دونوں کے گھر جو کہ پاس تھے وہ دور ہو گئے۔

تسنیم کے فادر ڈاکٹر تھے اُن کا دوسرے شہر میں ٹرانسفر ہو گیا۔تسنیم اپنے بچپن کی یادیں باتیں کھیل کود اسکول سہیلیاں سب چھوڑ کر دوسرے شہر کی نئی دھوپ چھاؤں کا سامنا کرتی رہی۔ وہاں وہ اسکول جاتی پڑھتی تعریفیں ہوئیں انعامات ملتے لیکن تسنیم کو کچھ اچھا نہیں لگتا۔اس کو اپنا پرانا گھر اپنی پرانی دھوپ چھاؤں سہیلیوں کے جھرمٹ ہنسنا ہنسانا دل بھر کے کھیلنا یاد آتا رہتا۔ساون کے میلے رمضان کے

روزے عید کی نمازیں وبہاریں بقرعید کے گوشت محرم کے تازیے بارہ وفات کا جلوس کھیل تماشے سانپ کا تماشہ کبھی جادوگروں کی جادوگری۔ نئے نئے کپڑے پہنا چہکنا اِترانا یہ سب یاد آتا یادیں اس کا پیچھا کرتی رہتیں۔ وہ اپنے پرانے قصبے کو نہیں بھولتی۔ آخر تسنیم کو اپنے نئے شہر میں اسکول میں وسہیلیوں میں و پڑھنے لکھنے میں دل لگانا ہی پڑا اس کی اچھی اچھی سہیلیاں بن گئیں۔ اسکول میں تعریفیں ہونے لگیں Twelveth پاس کر کے وہ B.A میں آگئی۔

لڑکیاں ذرا بڑی ہوئیں کہ رشتے آنا شروع ہوجاتے ہیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ وقت بھی آ گیا تسنیم کی بڑی بہن اوراس کے رشتے آنے لگے ۔تسنیم کے والد صاحب ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی بیماری کا شکار ہو گئے آخرایک دن دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے تسنیم کے دو بھائی تھے اور یہ دو بہنیں تھیں اب تسنیم کی والدہ اپنے پرانے قصبے میں واپس آ گئیں۔

فراز اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے وہاں سے بمبئی جا چکا تھا۔ اگر چہ تسنیم اور فراز کافی دن دور رہے لیکن ان دونوں کے دلوں میں ایک دوجے کی یادیں تازہ رہیں۔ اس درمیان فراز کبھی کبھی تسنیم سے ملا بھی لیکن کوئی بات نہیں ہو سکی۔ اب تسنیم کے اچھے اچھے رشتے آنا شروع ہو گئے آخر سب سے مشورہ کیا اورایک تعلیم یافتہ لڑکے سے تسنیم کا رشتہ طے کر دیا تاریخیں ٹھہر گئیں اور شادی کی تیاریاں زوروں پر چل رہی تھیں انہیں دنوں فراز بمبئی سے کچھ دنوں کے لئے آیا تب اس کو یہ رشتے کا پتہ چلا دل پر بہت چوٹ لگی وہ بہت افسردہ ہوا ابھی تک اس کے دل میں تسنیم سے محبت تھی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ تسنیم بھی مجھ سے محبت کرتی ہے یہ رشتہ طے ہونا اُس پر

ایک حادثہ کی طرح گزرا لیکن اب وہ کس منہ سے کیا کہتا۔

اگر وہ اپنی ممی سے پہلے سے ہی اس بات کا اظہار کر چکا ہوتا تو اس کی ممی تسنیم کا رشتہ طے کرنے کی نوبت نہیں آنے دیتیں فراز یہ سوچتا کہ اے کاش میں نے پہلے ہی ممی کو یہ سب بتلا دیا ہوتا تو اچھا تھا لیکن اب سب کچھ ختم ہو چکا سوائے ہاتھ ملنے کے۔

اداس۔اداس فراز تسنیم کے گھر گیا وہ پہلے ہی بظاہر روٹھی روٹھی رہتی تھی ابھی بھی اسی طرح پیش آئی اگرچہ اس کے دل میں بہت کسک ہو رہی تھی لیکن وہ بھی کِس زبان سے کیا کہتی ! دونوں دل اداس ہوئے اور ایک دوسرے سے اپنا حال بھی نہ کہہ سکے۔

ایسا وقت بھی نہ ملا کہ ضدی لڑکی تسنیم اپنے جذبات کا اظہار کرتی اپنی محبت کا یقین دلاتی لیکن اب ایک دوسرے سے کچھ کہنے سننے سے فائدہ بھی کیا تھا! تسنیم نے سوچ لیا کہ اب میں کسی اور کی ہونے والی ہوں اس لئے اب ان باتوں کے اظہار سے کیا ہوگا۔

ایک اچھے گھرانے میں بہت دھوم دھام سے تسنیم کی شادی ہوگئی فراز بیچارہ دل پر ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔کئی بار فراز نے کچھ کہنا چاہا لیکن تسنیم کی پھر وہی عادت تسنیم نے کچھ سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

آخر تسنیم کی رخصت ہوگئی وہ اپنی سسرال پہنچ گئی سسرال والے بہت اچھے تھے سب تسنیم سے بہت خوش تھے۔اور اس کو سب کا پیار ملتا تھا

تسنیم دل ہی دل میں فراز کو یاد کرتی اس کی باتیں اس کی چاہتیں اس کے

دل میں زندہ ہو جاتیں اور وہ اپنی پرانی دنیا میں کھو جاتی ۔ پھر سنبھل جاتی اور اپنی بے چینیاں چھپاتی گھبراتی پریشان ہوتی اپنے آپ کو حاضر رکھنے کی کوشش کرتی اور ڈرتی کہ کوئی میرے دل کا راز نہ جان لے۔

فراز دنوں تک اُداس رہا آخر وہ اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلا گیا وہاں وہ پیسہ کماتا رہا اور وقت گذارتا رہا۔

ایک دن ایسا آیا کہ تسنیم کے چہرے پر بہار آگئی وہ مسکرا رہی تھی خوش تھی اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی اس کا مرجھایا دل کھل گیا تھا۔ چہرے پر بہار تھی گلابی رُخصار دمک رہے تھے دل میں اطمینان وسکون تھا کیونکہ آج تسنیم نے سنا کہ فراز نے باہر رہتے ہوئے اپنے شہر کی ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے ۔ ہَوا میں غبارے اڑنے لگے دل میں سکون کی بنسی بجنے لگی۔

☆☆

آہ!

رات کے دو بج رہے تھے کہ اچانک بندوقوں کی گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں جب کہ اس وقت کالونی کے سارے لوگ نیند کی آغوش میں محوِخواب تھے۔ بندوق کی آوازوں سے سب کی نیند ٹوٹ گئی اور لوگ مکانوں سے باہر نکل کر دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئے کہ آخر یہ پُر سکون بستی میں اور رات کے وقت کون اور کیوں گولیاں چلا رہا ہے۔

انیس میاں صاحب جو اس کالونی کے بہت بزرگ اور معتبر انسان تھے سارے لوگ ان کی بیحد عزت واحترام کرتے تھے وہ اور اُن کے دونوں بیٹے رئیس خاں اور حنیف خاں باہر آگئے۔ آگئے والے گھر سے راکیش جی اور اُن کا بیٹا موہن باہر نکلا۔اِسی طرح سوہن، سنیل،ارجن، فہیم ،انور وغیرہ وغیرہ دھیرے دھیرے چاروں طرف کے لوگ گولیاں چلنے کی وجہ جاننے کے لئے اپنے اپنے مکانوں سے باہر نکل آئے۔

جب بزرگ انیس میاں نے دیکھا کہ وہ دونوں شخص گولیاں چلا رہے ہیں تو انیس میاں اُن سے گویا ہوئے ''کیوں بیٹا کیا بات ہے؟''تم لوگ یہاں کس کو تلاش کر رہے ہو؟ کیا کوئی چور چوری کر کے بھاگے ہیں، کس سمت میں گئے ہیں؟ کچھ بتلاؤ یہاں کھڑے ہوئے سب ہی لوگ تمہاری مدد کریں گے۔شاید وہ کسی گھر میں چھپ گئے ہونگے ،تم لوگ بھاگتے ہوئے کہاں سے آرہے ہو؟ وہ دونوں انیس میاں کو دومنٹ تک دیکھتے رہے پھر اچانک اُن کے سینے میں گولیاں داغ دیں وہ تڑپ کر فوراً

زمین پر جا گرے خون کی ترّارِیاں بہہ گئیں۔لوگ حیرت واستعجاب سے اُن کے آس پاس پہنچ گئے اور چلاّ چلاّ کر آوازیں دینے لگے چاچا، چاچا انیس میاں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے لوگ کہتے رہے ہائے چاچا کو کیوں مار ڈالا؟

یہ کہنا تھا کہ دو چار پانچ چھ اور سات لوگ ہتھیاروں سے لیس نظر آئے اور لوگوں پر گولیوں کی برسات کر دی بغیر بات کا جواب دیئے بغیر کسی وجہ کے چالیس پچاس لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔سڑک پر خون ہی خون بہہ گیا۔رات کی بھیگی ہوئی دلکش و پُر سُرور فضا ٹھٹک کر مغموم واُداس ہو گئی۔چیخیں، آہیں سُنائی دیتی رہیں پھر وہ لوگ آگے چل دیئے وہاں بم کے کئی دھماکے ہوئے۔نگر نگم کی بلڈنگ اور کئی عمارتیں جل گئیں کھڑکی دروازوں میں آگ نے زور پکڑ لیا۔مُسکراتے پھولوں وغنچوں والا پارک جل کے خاک ہو گیا۔لوگ عمارتوں کو فلیٹوں میں اپنا سامان جلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔بوکھلائے ہوئے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اب کیا ہوگا۔

پولس کی گاڑیاں آچکی تھیں۔فائر بریگیڈس آگ بجھانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔وہ لوگ کون تھے کہاں سے آئے تھے۔پولس ہر طرف دوڑ گئی اور تمام کارروائی میں مصروف ہو گئی تھی سرکاری افسر آگئے ہر طرح کی مدد درکار تھی۔لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔جو چلا گیا وہ تو واپس نہیں آسکتا تھا۔زمین اپنے سینے پر بہتے ہوئے لہو کے ایک ایک قطرے سے یہ وعدہ کر رہی تھی "میں بے گناہوں کا خون بہانے والوں کا بوجھ ہر گز ہر گز برداشت نہیں کرونگی"۔

لگتا تھا وہ دھرتی سینہ ٹھوک کر کہہ رہی تھی میرے اوپر اِترا کے چلنے والوں،

بے گناہوں کا خون بہانے والوں میں تم سے اُن کا انتقام لوں گی۔ میں ناپاک جسموں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی جو لوگ زمین کے، اور دولت کے پُجاری ہیں بے گناہوں کا خون بہاتے ہیں۔ اُن سے زندگی چھین کر خود اُن کی دھرتی پر راج کرنا چاہتے ہیں میں ایسا نہیں ہونے دونگی۔ میں ایسے سب لوگوں کو نگل جاؤں گی مجھ کو خدا نے طاقت دی ہے۔ جیسے آج یہاں بچے، بوڑھے اور جوان اپنے اپنے عزیزوں کے لئے چیخ رہے ہیں، بلک رہے ہیں اور رو رہے ہیں وہ دن دور نہیں کہ وہ آتنک وادی تڑپ تڑپ کر مریں گے اُن کی زمین ہوگی نہ آسمان، ہوا ہوگی نہ پانی۔ اُن کا خون ہی خون ہوگا اُن کو کوئی بھی رحم کی بھیک نہ دے گا میرا تم سب سے یہ وعدہ ہے۔ مغموم ہو کر آسمان رو رہا تھا فضائیں مغموم تھیں گھٹائیں آہ و بکا سن رہی تھیں جب دھرتی کا یہ وعدہ یہ عہد سنا تو ایک زوردار بجلی چمکی اور روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ زبردست ایک گونج و گرج ہوئی اور صبح ہوگئی۔ وہ صبح جو ان درندوں کو چیر کے رکھ دے گی جو لوگ دوسروں کی زمین چھین لینا چاہتے ہیں دوسروں کی زمین پر خود راج کرنا چاہتے ہیں اُن کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گی۔

ضرور ایسا ہی ہوگا قدرت کے سارے نظارے زمین و آسمان چاند ستارے ہوائیں گھٹائیں سب ہی دھرتی کے اس عہد میں شامل ہو چکے تھے۔ لگتا تھا مرحوموں کی روحیں جنت میں پرواز کر گئی ہیں لیکن زمین پر بچنے والوں کا حال بے حد دردناک و تکلیف دہ تھا۔ زندگی آہوں و آنسوؤں میں ڈوب چکی تھی!! آہ

☆☆

آراء

پہلی تصنیف ''اختر سعید خاں شخصیت اور فن کے بارے میں

۱) محترم جناب عشرت قادری صاحب

فیروزہ یاسمین نے اپنے مقالے میں موضوعات کا خصوصی خیال رکھا ہے اور اختر شناسی کے سلسلے میں امکانی کوشش کی ہے تاکہ کوئی پہلو گوشۂ قارئین کی نظروں سے اوجھل نہ رہے اس اعتبار سے یاسمین کی یہ تصنیف اختر سعید خاں کے ادبی سفر کی بہت حد تک مکمل داستان کہی جا سکتی ہے''

۲) پروفیسر جناب محترم آفاق احمد صاحب

'' مجھے یقین ہے کہ فیروزہ یاسمین نے اردو غزل کے اختر تابندہ کی ادبی سربلندی اور شاعرانہ عظمت اور باوقار شخصیت کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنا کر اختر شناسی کے سلسلے کا آغاز کیا تھا وہ جاری رہے گا۔اور ہر ایسے موقع پر ہم بے ساختہ یہ دعا دینے میں حق بجانب ہوں گے۔

''بیوی خوش رہو کہ خوشبو کو عام کرنے کے جس سلسلے کو تم نے شروع کیا تھا اب اس کی مہک لامحدود ہوگئی ہے''

۳) محترمہ پروفیسر شفیقہ فرحت صاحبہ

''فیروزہ جب ایم ایل بی گرلز کالج کی طالبہ تھیں جو ان کی علمی اور ادبی ! دور کی ابتدا تھی مگر چونکہ ان کا تعلق ایک ادبی اور علمی گھرانے سے ہے نیز ادبیت خون

میں شامل ہے رگوں میں دوڑ رہی ہے تو آہستہ آہستہ انہوں نے وقت کے ساتھ اپنی تمام صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور یہ ثابت کردیا کہ ادبی وراثت ماحول کی وقتی ناساز گاریوں سے کبھی دب نہیں سکتی"۔

۴) ڈاکٹر نصرت بانو روحی

اس کتاب کی قابل مصنفہ محترمہ فیروزہ یاسمین صاحبہ کے تعارف کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مجھے ایک نہایت خوشگوار مسرت کا احساس ہورہا ہے۔وہ ایک نہایت ذہین ،خوش طبع، اورخوش مزاج خاتون ہیں۔جنکی صحبت میں ایک گونہ خوشی کا احساس ہے وہ خود بھی شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں اس لئے ان کے سینے میں ایک نہایت حساس دل دھڑکتا ہے۔

☆

فیروزہ یاسمین کی جب پہلی تصنیف ''اختر سعید خاں شخصیت اور فن'' منظرِ عام پر آئی تو میں نے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ ان کی ادبی کامرانیوں کا سفر جاری رہے گا۔ میں نے اُن کی علمی سرگرمی اور تحقیقی مزاج کا ذکر کرتے ہوئے افسانہ نگاری کے میدان میں ان کی جولانیِ فکر کے بارے میں بھی لکھا تھا۔

مجھے خوشی ہے کہ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''احساس کے دریچے'' اشاعت کا جامہ پہن رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اختصار کے ساتھ کسی واقعہ کو کہانی کا روپ عطا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فیروزہ یاسمین الفاظ کی فضول خرچی کی قائل نہیں ہیں انہیں کم سے کم لفظوں میں کہانی لکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس مجموعہ کی بیشتر کہانیاں ۴ صفحات پر مشتمل ہیں صرف ایک کہانی ''ارمانوں کا خون'' ۸ صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ دو کہانیاں ''یہ کرایہ دار'' اور آپ کیوں شرمندہ ہیں'' ۶ صفحات پر اور دو کہانیاں ''اتفاق'' اور ''برقعہ نہ ملا'' تو صرف دو صفحات کی ہیں جنہیں منی کہانیاں کہا جا سکتا ہے۔

کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کہنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن فیروزہ نے طول کلامی سے اپنا دامن بچاتے ہوئے واقعہ کے بیان میں جس طرح موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے اِن کی داد اُنہیں ضرور دینا چاہئے۔

اپنے آس پاس کے ماحول اور زندگی سے جڑے ہوئے واقعات جذبات اور احساسات کو رہنما بنا کر فیروزہ یاسمین نے ''احساس کے دریچے'' کو پیش کیا ہے۔

اب مجھے فیروزہ یاسمین کے شعری مجموعہ کا انتظار ہے کہ وہ ''شہرِ غزل'' بھوپال میں نظم گوئی کو اپنی شناخت بنائے ہوئے ہیں۔

☆☆

پروفیسر آفاق احمد

گل کدہ، عیدگاہ ہلز، بھوپال

Printed At : Alok Press, Bhopal